یا اللہ مدد | حیات النبی ﷺ زندہ باد | شان سلف زندہ باد | اصل کلمۂ اسلام لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ | شان صحابہ زندہ باد | مقام امام اعظم ابو حنیفہ زندہ باد | حق چار یار

اکابرین دیوبند بالخصوص شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کے افکار ونظریات کا بے باک ترجمان

مجلہ صفدر

بفیضان

مظہر شریعت وطریقت قائد اہل سنت وکیل صحابہ

حضرت مولانا قاضی مظہر حسین نور اللہ مرقدہ

تلمیذ رشید وخلیفہ مجاز شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ

بیاد

محدث عرب وعجم آبروئے دیوبند امام اہل السنۃ والجماعۃ

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر نور اللہ مرقدہ

تلمیذ رشید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ، خلیفہ امام الموحدین حضرت حسین علی، مجاز رئیس المفسرین حضرت مولانا

مفسر قرآن ولی کامل حضرۃ مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتی نور اللہ مرقدہ	فقیہ العصر ترجمان دیوبند حضرۃ مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی نور اللہ مرقدہ
شیخ المشائخ امام الاولیاء حضرۃ مولانا خواجہ خان محمد نور اللہ مرقدہ	فخر اہل سنت وکیل صحابہ حضرۃ مولانا عبداللطیف جہلمی نور اللہ مرقدہ
حکیم العصر شہید اسلام حضرۃ مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید نور اللہ مرقدہ	امین ملت مناظر اسلام حضرۃ مولانا محمد امین صفدر اوکاڑوی نور اللہ مرقدہ
پاسبان مسلک احناف شیخ الحدیث حضرۃ مولانا محمد حنیف نور اللہ مرقدہ	ترجمان مسلک دیوبند مولانا نور محمد تونسوی نور اللہ مرقدہ
وکیل صحابہ حضرۃ مولانا علامہ علی شیر حیدری شہید نور اللہ مرقدہ	جانشین شہید اسلام محقق العصر حضرۃ مولانا سعید احمد جلالپوری شہید نور اللہ مرقدہ

بدعا: وکیل صحابہ حضرۃ مولانا عبدالستار تونسوی نور اللہ مرقدہ — حکیم العصر شیخ الحدیث حضرۃ مولانا عبدالمجید لدھیانوی نور اللہ مرقدہ

سرپرست

پیر طریقت شیخ الحدیث حضرۃ مولانا حبیب الرحمٰن سومرو صاحب مدظلہ

نگران

وکیل احناف مناظر اسلام حضرۃ مولانا مفتی محمد انور اوکاڑوی صاحب مدظلہ

مدیر اعلیٰ	مدیر مسئول	مدیر
مولانا جمیل الرحمٰن عباسی	مولانا احسن خدامی	حمزہ احسانی
0301-7790908	0320 4902150	0307-5687800

فی شمارہ: 25......زر سالانہ: 300 روپے

برائے رابطہ: احسن خدامی، مکان نمبر 4، گلی نمبر 82، محمود سٹریٹ، محلہ سردار پورہ، اچھرہ، لاہور

ترتیب

حیاتِ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ......ایک نظر میں!

۱۲۶۸ھ ہجری میں بریلی میں ولادت۔ اصل وطن دیوبند ضلع سہارنپور۔ قرآن پاک میاں جی منگلوری سے۔ فارسی ابتدائی کتب مولانا عبداللطیفؒ سے۔ کتب فارسی کی تکمیل اور ابتدائی عربی کتب اپنے چچا مولانا مہتاب علیؒ سے۔ ۱۵؍محرم ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کا افتتاح ہوا تو پہلے طالب علم ہوئے۔ ۱۲۸۶ھ صحاح ستہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ سے پڑھیں۔ مولانا یعقوب نانوتویؒ کے بھی شاگرد ہوئے۔ ۱۹؍ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ کو سند فراغ پائی۔

۱۲۸۸ھ سے دیوبند میں مدرس چہارم کی حیثیت سے آغاز تدریس۔ ۱۶؍سال تدریس۔ ۱۳۰۵ھ میں صدر مدرس وشیخ الحدیث۔ ۱۳۳۳ھ تک۔ ۴۴؍سال کل عرصۂ تدریس۔ ۱۳۲۹ھ جنگ بلقان میں حصہ لیا، ترکوں کی مدد کی۔ ۱۳۲۷ھ میں جمعیۃ الانصار کی بنیاد ڈالی۔ مولانا سندھی سیکرٹری مقرر ہوئے۔ طائف میں گرفتار ہوئے۔ ۱۸؍ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کو روانہ کیے گئے۔ ۲۷؍ربیع الاول کو مالٹا پہنچائے گئے۔ بغاوت کے الزام میں مقدمہ کا چلایا گیا۔ ۱۳۳۵ میں مالٹا ہی میں قید کر دیئے گئے۔ ۲۹؍ربیع الثانی ۱۳۳۵ کو مالٹا پہنچے۔ شوال ۱۳۳۵ھ سے ترجمہ قرآن کا کام شروع کیا۔ ۲؍شوال ۱۳۳۶ھ میں تکمیل ہوئی۔ سورۃ نساء تک تفسیری حواشی بھی انہی ایام میں لکھے۔ پھر رہا ہوئے۔ ۱۳۳۸ھ کو دیوبند پہنچے۔ تحریک خلافت میں حصہ لیا۔ بیمار ہوئے۔ ۱۸؍ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو وفات پائی۔ تلامذہ میں حضرت تھانوی، حضرت مدنی، حضرت کشمیری، حضرت سندھی اور حضرت مفتی کفایت اللہ رحمہم اللہ شامل ہیں۔ [تفسیر عثمانی: ۹/۱]

پیامِ صفدر مدیرِ مسئول کے قلم سے

مولانا محمد اسماعیل محمدی رحمہ اللہ......لفظ ’’خدا‘‘ کا استعمال..!

حضرت مولانا محمد اسماعیل محمدی رحمہ اللہ:

مناظرِ اہل سنت مولانا اسماعیل محمدی رحمہ اللہ بھی گذشتہ سے پیوستہ ماہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون......! آپ حضرت اوکاڑوی رحمہ اللہ کے خصوصی تلامذہ میں سے تھے، اللہ جل شانہ نے وسعتِ علم، کثرتِ مطالعہ اور ذہانت ونکتہ سنجی کی خوبیوں سے خوب نوازا تھا۔ ابتدائی عمر غیر مقلدی میں گذری تھی اور پھر اللہ جل شانہ نے خودسری وخود پرستی کے اس خول سے نکال کر تقلید ائمۂ اسلام اور اتباعِ اسلاف کی دولت سے نوازا تھا۔ اپنی آنکھوں سے ترک تقلید کے نتائج کا مشاہدہ کرنے کی بناء پر ترکِ تقلید اور خود رائی کا بطلان خوب آپ کے سامنے واضح تھا اور تا زندگی اس بیماری سے لوگوں کو بچانے کے لیے سعی بلیغ فرماتے رہے۔ حضرات اہل بیت رحمہم اللہ تعالیٰ سے محبت کوٹ کوٹ کر دل میں بھری ہوئی تھی، آخری عمر میں اپنے آپ کو ان کے مناقب بیان کرنے کے لیے وقف فرما دیا تھا، دیگر علماء کرام کی طرف سے اس موضوع پر کوتاہی پر کڑھتے تھے......بلکہ بعض ملاقاتوں میں اندازہ ہوا کہ اس سلسلہ میں اب مزاج اعتدال سے بڑھ کر کچھ مائل بافراط ہو چلا ہے......تاہم اللہ جل شانہ کی رحمت سے مزاج کا یہ افراط مزاج تک ہی محدود رہا اور بفضلہٖ تعالیٰ عقیدے میں کسی خلل کی نوبت تک نہ پہنچا...... بندہ کے اجداد کرام کی نسبت سے بندہ سے بہت شفقت و محبت کا برتاؤ فرماتے تھے اور ویسے بھی طلبہ کرام کے گروہ سے بڑی محبت وعنایت سے پیش آتے تھے۔ ایک دینی سفر سے واپسی میں اچانک دل کا دورہ پڑا اور اپنے ہم سفروں کے سامنے کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے جان حق تعالیٰ شانہ کے سپرد کی......تا زندگی دوسروں کے ایمان بچانے کے لیے اپنے آپ کو وقف رکھنے والے دین کے اس بے لوث سپاہی کو بوقت رخصت کلمہ طیبہ کی عظیم الشان نعمت حق تعالیٰ شانہ کی بارگاہ سے بطور انعام نصیب ہوئی......الحاد وزندقہ کے سیلاب میں بہتی اس دنیا میں اس وقت اس سے زیادہ قابلِ رشک انعام بھلا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اللہ جل شانہ ان کی حسنات کو قبول فرمائیں، خطاؤں سے درگذر فرمائیں اور ان کے اعمال صالحہ کو صدقۂ جاریہ بنائیں......آمین یارب العلمین۔

کیا اللہ جل شانہ کو ’’خدا‘‘ کہنا غلط ہے؟

دین کے معاملے میں خود رائی ایک ایسی بری بیماری ہے جو انسان کو کسی برے انجام تک پہنچا کر ہی چھوڑتی ہے۔ اپنی کسی رائے اور خیال کا دل ودماغ میں ایسا سما جانا کہ سلف وخلف کے اکابر واہل علم کے تعامل کو غلط سمجھ کر انسان اپنے آپ کو ہی برحق سمجھتا پھرے تو یہ دماغی خلل کی علامت ہے (**بقیہ** ٹائٹل نمبر ۳ پر)

(ٹائٹل نمبر ۲ کا **بقیہ**) اور یہ دماغی خلل اور مشہور ہونے کا شوق انسان کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ کوئی ایسی رائے پیش کرے جو پہلے کسی نے پیش نہ کی ہو، جس کو سن کر لوگ بے اختیار ٹھٹھک اور بدک جائیں، جو دیکھتے ہی دیکھتے ازراہِ تعجب لوگوں میں شہرت پکڑ لے اور یوں رائے گھڑنے والے شہرت کے مریض کی تسکین قلب کا سبب بن جائے......اس بیماری کے وباء کی صورت اختیار کر جانے کے باعث ہر روز کسی نہ کسی کونے سے کسی شعبدہ باز کی طرف سے کوئی نامانوس، اجنبی، تعجب خیز اور چونکا دینے والی رائے پیش کی جاتی ہے، صاحب رائے کے کچھ حواری ڈگڈگی بجا بجا کر لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرتے ہیں، لوگ غصے، تعجب، افسوس، پسندیدگی اور تحقیر وغیرہ کے ملے جلے تاثرات سے اس رائے کو سنتے اور حیرت سے دوسروں کو اس نئے شگوفے سے آگاہ کرتے ہیں اور لوگوں کی زبانوں پر یہ چندروزہ ذکر اس شہرت کے مریض کے دل کو باغ باغ کر جاتا ہے اور پھر اس کا دماغ کسی نئے شگوفے کی تلاش میں سرگرم ہو جاتا ہے۔

اسی مزاج کے بعض حضرات کچھ عرصہ سے بصورتِ تحریک یہ مہم چلائے ہوئے ہیں کہ اللہ جل شانہ کو ''خدا'' کہنا بالکل درست نہیں، اور اپنی تائید میں وہ فرماتے ہیں کہ: [۱] لفظِ خدا لفظِ اللہ کا ترجمہ نہیں، اس لیے اسے لفظِ اللہ کے متبادل استعمال نہیں کیا جا سکتا......[۲] لفظِ اللہ سب سے جامع اور افضل نام ہے، اس کے ہوتے ہوئے غیر افضل اور غیر جامع لفظ استعمال کرنا درست نہیں...... [۳] اللہ جل شانہ کے صفاتی ناموں میں سے کوئی نام بھی ''خدا'' نہیں ہے......[۴] اس میں تشبہ بالکفر ہے۔

ذرا سا غور کیا جائے تو یہ سب دلائل بے حد سطحی ہیں، اس لیے کہ: [۱] لفظِ خدا ''مالک'' یا ''رب'' کا فارسی ترجمہ ہے اور جس طرح اللہ جل شانہ کو رب یا مالک کہہ کر پکارنا درست ہے اسی طرح خدا کہہ کر پکارنا بھی درست ہے......[۲] افضل اور جامع لفظ کے ہوتے ہوئے غیر افضل اور غیر جامع لفظ کا استعمال بالکل درست ہے، اللہ جل شانہ کے منصوص صفاتی ناموں کی افضلیت اسم ذات سے کم ہے لیکن ان کا استعمال ممنوع نہیں مندوب ہے......[۳] اللہ جل شانہ کو اس کی شان کے لائق اور اس کی صفات کی خبر دینے والے کسی بھی زبان کے کسی بھی لفظ سے پکارا جا سکتا ہے، جیسے اے ہمارے پروردگار! اے ہمارے آقا! وغیرہ۔ بہت سے انبیائے کرام کی زبان عربی نہیں تھی، کیا وہ اللہ جل شانہ کو اپنی اپنی زبان کے الفاظ سے نہیں پکارتے تھے؟......[۴] اگر لفظِ خدا کفار کے کسی معبود کا علَم ہوتا تو یقیناً اس کا استعمال حرام ہوتا لیکن یہ کسی معبود باطل کا علَم نہیں بلکہ رب یا مالک کا فارسی ترجمہ ہے اور فارسی یا کفار کی کسی بھی زبان کو بولنا تشبہ بالکفار نہیں ہے......[۵] ماضی قریب و بعید کے حضرات اکابر اس لفظ کو اللہ جل شانہ کے لیے استعمال کرتے آئے ہیں اس لیے اس کے استعمال میں قطعاً کوئی حرج نہیں۔ اللہ جل شانہ ہم سب کو دین کی سمجھ نصیب فرمائیں۔

والسلام......احسن خدامی......۱۱ رصفر الخیر ۱۴۳۸ھ

مولانا مفتی محمد راشد ڈسکوی

تریسٹھ (۶۳) سالہ حیات نبوی کی ایک جھلک

سیدنا و مولانا حضرت محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ ﷺ کی ولادت باسعادت پیر کے روز صبح صادق کے وقت ربیع الاول، عام الفیل، بمطابق اپریل ۵۷۱ء میں ہوئی۔ آپ ﷺ کی ولادت سے چند مہینے پہلے آپ ﷺ کے والدِ محترم حضرت عبداللہ کی وفات ہوگئی۔ آپ ﷺ کے دادا جان عبدالمطلب کی طرف سے آپ ﷺ کا اسم گرامی ''محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب'' ہے۔ آپ ﷺ کی والدہ محترمہ حضرت آمنہ کی طرف سے آپ ﷺ کا نام ''احمد'' تجویز ہوا۔ ابولہب کی آزاد کردہ باندی حضرت ثویبہؓ کے چند دن دودھ پلانے کے بعد شرفاءِ قریش کی عادت کے مطابق آپ ﷺ کو حضرت حلیمہ سعدیہؓ کی رضاعت میں دے کر مضافات مکہ میں بھیج دیا۔ اس وقت آپ ﷺ آٹھ دن کے تھے۔

ولادت کے چوتھے سال شق صدر کا واقعہ پیش آیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ شق صدر کا واقعہ چار بار پیش آیا۔ پہلی بار: زمانہ طفولیت میں حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے پاس۔ دوسری بار: دس سال کی عمر میں پیش آیا۔ [فتح الباری: ۱۳/۴۸۱] تیسری بار: واقعہ بعثت کے وقت پیش آیا۔ [مسند أبي داؤد الطيالسي :۲۱۵] اور چوتھی بار: واقعہ معراج کے موقع پر۔ [صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۳۴۹]۔ بعض نے پانچویں بار کا شق صدر بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن وہ صحیح قول کے مطابق ثابت نہیں ہے۔ [سیرۃ مصطفیٰ: ۱/۷۵] آپ تقریباً چھ سال تک حلیمہ سعدیہؓ کی پرورش میں رہے۔

ولادت کے چھٹے سال آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ نے مدینہ منورہ اپنے میکے میں ایک ماہ کا قیام کیا۔ وہاں سے واپسی پر مقام ابواء میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئیں۔

[شرح المواهب للزرقاني: ۱/۱۶۰]

ولادت کے ساتویں سال آپ ﷺ اپنے دادا عبدالمطلب کی تربیت و کفالت میں رہے۔

ولادت کے آٹھویں سال دادا محترم کا انتقال ہوگیا۔ دادا کے انتقال کے بعد آپ ﷺ اپنے چچا ابوطالب کی کفالت میں آگئے۔ [طبقات ابن سعد: ۱/۷۴]

ولادت کے بارھویں سال آپ نے اپنے چچا کے ساتھ شام کے پہلے تجارتی سفر میں شرکت کی۔ اسی سفر میں بحیرہ راہب نے آپ ﷺ کی نبوت کی پیش گوئی بھی دی۔ [الخصائص الکبری: ۱/۸۴]

ولادت کے چودھویں یا پندرھویں سال اور بعض روایات کے مطابق بیسویں سال عربوں کی

مشہور لڑائی ''حرب الفجار'' پیش آئی۔ اس جنگ میں آپ اپنے بعض چچاؤں کے اصرار پر شریک تو ہوئے۔ لیکن قتال میں حصہ نہیں لیا۔ [روض الانف: ۱/۱۲۰]

ولادت کے سولہویں سال میں آپ نے اہل مکہ کے حلف الفضول نامی معاہدے میں شرکت کی۔

ولادت کے پچیسویں سال آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کا مال لے کر تجارت کا دوسرا سفر شام کی طرف کیا۔ سفر سے واپسی پر اس سفر میں پیش آنے والے واقعات، تجارتی نفع اور آپ ﷺ کے اخلاق وواقعات سن کر دو مہینہ اور پچیس روز کے بعد حضرت خدیجہؓ نے آپ کو نکاح کا پیغام بھجوا کر آپ سے نکاح کر لیا۔ [طبقات ابن سعد: ۱/۸۳]

ولادت کے پینتیسویں سال آپ ﷺ نے بیت اللہ کی ہونے والی تیسری تعمیر کے وقت حجر اسود کو اپنے دست اقدس سے نصب فرما کر خانہ جنگی کے لیے کمر بستہ قبائل قریش کے درمیان باہمی محبت والفت پیدا فرما دی اور اس کٹھن مرحلے کو بحسن و خوبی انجامِ خیر تک پہنچایا۔ [سیرت ابن ہشام: ۱/۶۵]

حیات طیبہ کے اکتالیس سالوں میں آپ ﷺ کا کردار ایسا بے مثال رہا کہ اپنے تو اپنے بلکہ غیروں کی زبان پر آپ ﷺ کے بارے میں تھا کہ آپ ﷺ صادق اور امین ہیں۔

ولادت کے چالیسویں سال میں آپ ﷺ نے زیادہ وقت غار حرا میں گذارا۔ یہاں ہی آپ ﷺ کے سر پر نبوت کا تاج رکھا گیا......نبوت کے پہلے سال غارِ حرا میں آپ ﷺ پر سورہ علق کی پہلی پانچ آیات نازل ہوئیں۔ (شرح المواہب: ۱/۲۰۷) باتفاق مؤرخین آپ کو نبوت اتوار کے دن عطا ہوئی۔ لیکن مہینہ کے بارے میں مؤرخین کا اختلاف ہے۔ ابن عبد البرؒ کے نزدیک آٹھ ربیع الاول کو نبوت سے سرفراز ہوئے۔ اس قول کی بنا پر بوقت بعثت آپ کی عمر چالیس سال تھی۔ جبکہ ابن اسحاقؒ کے قول کے مطابق سترہ رمضان کو آپ ﷺ کو نبوت ملی۔ اس قول کے مطابق بوقت بعثت آپ ﷺ کی عمر چالیس سال اور چھ ماہ تھی۔ حافظ ابن حجرؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ [فتح الباری، کتاب التعبیر: ۱۲/۳۱۳]

نبوت کے دوسرے سال میں آپ ﷺ خفیہ تبلیغ فرماتے رہے۔ اسی سال حضرت خدیجہ، حضرت ورقہ بن نوفل، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت جعفر بن ابی طالب، حضرت عفیف کندی، حضرت طلحہ، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت خالد بن سعید، حضرت عثمان بن عفان، حضرت عمار، حضرت صہیب، حضرت عمرو بن عنبسہ اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم اجمعین آپ ﷺ پر ایمان لائے۔ یہ سب اور کچھ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ سابقین اولین صحابہ کہلاتے ہیں۔

نبوت کے تیسرے سال آپ ﷺ کے متبنیٰ حضرت زید بن حارثہؓ کے بیٹے حضرت اسامہ کی ولادت ہوئی۔

نبوت کے چوتھے سال آپ ﷺ کو علی الاعلان دعوت دین دینے کا حکم ہوا جس کی بنا پر کفار خصوصاً قریش کی طرف سے بھی کھلم کھلا دشمنی اور بغض وعداوت کا مظاہرہ ہونے لگا۔اسی سال حضرت عائشہؓ کی ولادت ہوئی۔

نبوت کے پانچویں سال حضرت جعفر بن ابی طالبؓ مشرف بہ اسلام ہوئے۔اسی سال حبشہ کی طرف پہلی اور دوسری ہجرت ہوئی۔ پہلی ہجرت میں گیارہ مرد اور پانچ عورتیں شامل تھیں۔[فتح الباری: ۱۸۰/۱] دوسری ہجرت میں چھیاسی مرد اور سولہ عورتیں شامل تھیں۔[سیرۃ ابن ہشام: ۱۱۱/۱] اسی سال حضرت سمیہؓ کو ابوجہل ملعون کے ہاتھوں شہادت نصیب ہوئی۔ یہ اسلام کی خاطر شہید ہونے والی پہلی خاتون ہیں۔

نبوت کے چھٹے سال حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ان کی برکت سے مسجد حرام میں نماز اعلانیہ ادا کی گئی۔ [شرح المواہب: ۲۷۶/۱]

نبوت کے ساتویں سال مقاطعۂ قریش کا واقعہ پیش آیا۔آپ ﷺ کے ساتھ بنو ہاشم اور بنو مطلب شعب ابی طالب میں محصور کر دیئے گئے۔اسی دوران آپ ﷺ کے چچا زاد بھائی عبد اللہ بن عباسؓ کی ولادت ہوئی۔ [روض الانف: ۲۳۲/۱]

نبوت کے آٹھویں سال مشرکین مکہ کے مطالبہ پر شق قمر کا بے مثال معجزہ رونما ہوا۔

[البدایہ والنہایہ: ۱۱۸/۳]

نبوت کے نویں سال میں بھی آپ ﷺ شعب ابی طالب میں ہی محصور رہے۔

نبوت کے دسویں سال مقاطعہ ختم ہوا۔[طبقات ابن سعد: ۱۳۹/۱] اسی سال آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کا انتقال ہوا۔ان کے انتقال کے تقریباً تین یا پانچ دن بعد حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا۔حضور ﷺ نے اس سال کو عام الحزن قرار دیا۔[شرح المواہب: ۲۹۱/۱] اسی سال آپ ﷺ کا نکاح حضرت سودہ بنت زمعہؓ سے ہوا۔اسی سال حضرت عائشہؓ آپ ﷺ کے نکاح میں آئیں۔لیکن رخصتی نہیں ہوئی۔اسی سال واقعۂ طائف بھی پیش آیا۔[البدایہ والنہایہ: ۱۳۵/۳]

نبوت کے گیارہویں سال مدینہ سے آنے والے حاجیوں میں سے آپ ﷺ کی دعوت سے تقریباً چھ آدمی مشرف بہ اسلام ہوئے۔اس سے انصار کے اسلام کا آغاز ہوا۔[البدایہ والنہایہ: ۱۴۸/۳]

نبوت کے بارھویں سال آپ ﷺ کو معراج ہوئی اور اسی موقع پر امت پر پانچ نمازیں فرض ہوئیں۔اسی سال بیعت عقبۂ اولیٰ ہوئی۔اس میں بارہ افراد مشرف بہ اسلام ہوئے۔[شرح المواہب: ۳۱۶/۱]

نبوت کے تیرھویں سال بیعت عقبہ ثانیہ ہوئی جس میں ۷۳ مرد اور ۲ عورتوں نے اسلام قبول کیا۔اسی سال مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مل گئی۔اسی سال قریش نے نعوذ باللہ!

آپ ﷺ کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آ کر آپ ﷺ کو قریش کی سازش سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہاں سے ہجرت کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اجازت ملنے پر آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ساتھ لے کر مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

حیات نبوی ﷺ کا مدنی دور:

جناب نبی اکرم ﷺ کی ہجرت کے بعد کی حیاتِ مبارکہ کا دور ''مدنی دور'' کہلاتا ہے۔ جو کہ بڑا تابناک دور ہے جس میں آپ ﷺ کی ان تھک کوششوں، محنتوں اور قربانیوں کے سبب اسلام کو غلبہ ہی غلبہ ملا۔ آپ ﷺ کی جانثار جماعت قدسیہ کے سرفروشوں نے اسلام کی نشر واشاعت کے لیے آپ ﷺ کے اشاروں پر اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دیا۔ آپ ﷺ کے اس بے مثال دور کا نقشہ کھینچنے کی منظر کشی اتنی طویل ہے کہ شاید کئی ضخیم مجلدات بھی اس موضوع کو اپنے پیٹ میں نہ سما سکیں۔ ذیل میں بہت ہی اختصار کے ساتھ ہجرت کے بعد کی زندگی کو اشارۃً بطورِ ایک جھلک کے پیش کیا جاتا ہے:

ہجرت کے پہلے سال آپ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہمراہ تین دن تک غارِ ثور میں روپوش رہنے کے بعد یکم ربیع الاوّل کو مدینہ کی جانب ہجرت کی۔ اسلام کی پہلی مسجد مسجد قباء کی بنیاد رکھی۔ مدینے کے یہودی اور آس پاس کے رہنے والے قبیلوں سے امن اور دوستی کے عہد نامے ہوئے۔ اسی سال حضرت سلمان فارسیؓ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسی سال مسجد نبوی کی بھی تعمیر کی گئی۔ اذان واقامت کی ابتداء بھی کی گئی۔ انصار اور مہاجرین کے درمیان ایک مثالی بھائی چارہ قائم ہوا جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔ اسی سال شوال میں حضرت عائشہؓ کی رخصتی بھی ہوگئی۔

ہجرت کے دوسرے سال مسلمانوں پر جہاد فرض ہوا۔ رمضان المبارک کے روزے، زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور عیدین کی نمازیں فرض ہوئیں۔ مسجد اقصیٰ کے بجائے بیت اللہ کو جہتِ قبلہ قرار دیا گیا۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے ہوا۔ آپ ﷺ کی لخت جگر حضرت رقیہؓ کا وصال بھی اسی سال ہوا۔ حق وباطل کا پہلا غزوہ بدر بھی اسی سال پیش آیا۔

ہجرت کے تیسرے سال آپ ﷺ کا حضرت حفصہ بنت فاروقؓ سے اور اس کے بعد حضرت زینب بنت خزیمہؓ سے نکاح ہوا۔ حضرت حسن بن علیؓ کی ولادت ہوئی۔ آپ ﷺ کی لخت جگر حضرت ام کلثومؓ کا حضرت عثمانؓ سے نکاح ہوا۔ گستاخان رسول کعب بن اشرف اور ابورافع کو جہنم رسید کیا گیا۔ اسی سال غزوۂ احد کا واقعہ پیش آیا۔

ہجرت کے چوتھے سال بنونظیر کی جلاوطنی ہوئی۔ حضرت حسینؓ کی ولادت ہوئی۔ اسی سال آپ ﷺ کا حضرت ام سلمہؓ سے نکاح ہوا۔ شراب کے حرام ہونے کا حکم بھی اسی سال نازل ہوا۔

ہجرت کے پانچویں سال شرعی پردہ کا حکم نازل ہوا۔ زنا کی سزا کا حکم ہوا۔ صلاۃ الخوف کی مشروعیت ہوئی۔ تیمّم کی اجازت ملی۔ واقعہ افک ہوا اور حضرت اماں عائشہؓ کی شان میں سورۃ النور نازل ہوئی۔ آپ ﷺ کا حضرت جویریہ بنت حارثؓ سے اور حضرت زینب بنت جحشؓ سے نکاح ہوا۔ غزوہ خندق، غزوہ بنی مصطلق اور غزوۂ بیر معونہ پیش آیا جس میں ۷۰ حفاظ صحابہ کرامؓ کو دھوکے سے شہید کیا گیا۔

ہجرت کے چھٹے سال مالدار مسلمانوں پر حج فرض ہوا۔ سورۃ الفتح نازل ہوئی۔ اسی سال حدیبیہ کی صلح ہوئی۔ آپ ﷺ ۱۴۰۰ صحابہ کرامؓ کے ہمراہ حج کے لئے روانہ ہوئے۔ صلح حدیبیہ سے واپسی کے بعد دیگر ممالک کے بادشاہوں کو دعوتی خطوط روانہ فرمائے۔ اسی سال مدینہ منورہ میں قحط پڑا جو آپ ﷺ کی دعا سے دور ہوا۔

ہجرت کے ساتویں سال غزوہ خیبر پیش آیا۔ اس غزوہ سے واپسی پر لیلة التعریس کا واقعہ پیش آیا جس میں پورے لشکر کی نماز فجر قضا ہوگئی۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے اسلام قبول کیا۔ ایک یہودی عورت زینب بنت حارث کی طرف سے آپ ﷺ کو زہر دینے کی کوشش کی گئی۔ آپ ﷺ کا حضرت ام حبیبہ رملہ بنت ابی سفیان، حضرت میمونہ بنت حارث، اور حضرت صفیہ بنت حییؓ سے نکاح ہوا۔ حضرت صفیہؓ آپ ﷺ کی آخری زوجہ ہیں۔

ہجرت کے آٹھویں سال حضرت خالد بن ولید اور عمرو بن العاصؓ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آپ ﷺ نے عمرہ القضاء فرمایا۔ غزوہ موتہ اور فتح مکہ کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا۔ حضرت ابوسفیانؓ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ غزوہ حنین وطائف ہوا۔ حضرت ابو بکرؓ کے والد ابوقحافہ نے اسلام قبول کیا۔ اسی سال آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔

ہجرت کے نویں سال غزوۂ تبوک پیش آیا۔ اس غزوہ سے واپسی پر منافقین کی بنائی ہوئی مسجد ضرار کو منہدم کر دیا گیا۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی سلول کی موت ہوئی۔ اس سال ستر (۷۰) سے زائد وفود آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سورۃ التوبہ نازل ہوئی۔ اسی سال حج فرض ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امیر الحج بنا کر تین سو افراد کے ساتھ حج کے لئے بھیجا گیا۔

ہجرت کے دسویں سال مسیلمہ کذاب نے اور اسود عنسی نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا۔ حجۃ الوادع کے موقع پر آپ ﷺ نے خطبہ دیا۔ اس خطبے میں آپ ﷺ کی تمام ازواج مطہراتؓ موجود تھیں۔ جن کی تعداد ۹ تھی اور صحابہ کرام کی تعداد ۱،۰۰،۰۰۰ (ایک لاکھ) سے متجاوز تھی۔ اس موقع پر اسلام کے سارے اصول سمجھا دیئے گئے۔ جاہلیت کی رسموں کو اور شرک کی باتوں کو ملیامیٹ فرما دیا۔

اور پھر اسی سال امت کو الوداع کہتے ہوئے پوری امت مسلمہ بلکہ پوری کائنات کو یتیم کرتے ہوئے آپ ﷺ اپنے محبوب حقیقی اللہ جل جلالہ سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! ☆☆☆☆ ☆☆

از: مولانا توحید عالم بجنوری، مدرس دارالعلوم دیوبند

اہل السنۃ والجماعۃ کون ہیں اور کیا ہیں؟

امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کا ابتدائی دور سے آج تک بڑا طبقہ اور سوادِ اعظم جس منہج وراستہ پر ہے، وہ وہی راستہ ہے جس کو زبانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے نجات کا راستہ قرار دیا تھا اوراسی راہ کے راہی اہل السنۃ والجماعۃ کہلاتے ہیں؛ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق جو جماعت اورگروہ قرآن وسنت اور جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے راستہ کومضبوطی سے پکڑ کر راہِ منزل اختیار کرے گا وہ بہ سلامت منزلِ مقصودتک پہنچ جائے گا اور جوفرقہ مذکورہ اصولِ ثلاثہ یاان میں سے کسی ایک سے بھی گریز کرکے راہِ سفر طے کرے گا وہ زیغ وضلال میں مبتلا ہوجائے گا اورنجات پانے والی جماعت سے نہیں ہوگا؛ بلکہ ناری اور جہنمی فرقوں میں شامل ہوجائے گا۔اس سلسلہ میں متکلم اسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ؒمہتمم دارالعلوم دیوبند کی جامع تحریر جوحضرت موصوف نے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ صدرالمدرسین وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے ایک مکتوبِ گرامی بنام ''مودودی دستور اور عقائدکی حقیقت'' کے مبسوط مقدمہ میں رقم فرمائی ہے،اس کوبعینہ نقل کرتا ہوں:

"عَـن عَبـدِ الـلّٰـهِ بنِ عَمرِو بنِ العَاصِ قَالَ قَالَ رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم تَفتَرِقُ أُمَّتِـي عَلىٰ ثَلاثٍ وَّسَبعِينَ مِلَّةً كُلّهُم فِي النَّارِ الاّ مِلَّةً واحدةً، قِيلَ مَن هُم؟ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! قَالَ: مَا أنَـا عَلَيهِ وَأصحَابِي. [مختصرًا عن المشكاة] ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت تہتر ملتوں پر تقسیم ہوجائے گی،سوائے ایک کے سب جہنم میں ڈالے جائیں گے، پوچھا گیا کہ وہ (مستثنیٰ) کون ہیں یارسول اللہ؟ تو فرمایا کہ جولوگ میرے اور میرے اصحاب ؓ کے طریق پر ہیں۔

اس حدیث میں فرقِ اسلامیہ کی نجات وہلاکت اور بہ الفاظ دیگران کے حق وباطل ہونے کا معیار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے کہ وہ میرا اور میرے صحابہ کا طریقہ ہے؛لیکن اس طریقہ کوشخصیتوں سے الگ کرکے تنہا کو معیار نہیں بتلایا؛ بلکہ اپنی ذاتِ بابرکات اور اپنے صحابہ کی ذواتِ قدسیہ کی طرف منسوب کرکے معیار بتلایا کہ وہ ان شخصیتوں کے ضمن میں پایا جائے۔ ورنہ بیانِ معیار میں اس نسبت اور نام زدگی کی ضرورت نہ تھی؛ بلکہ **مَن هُم** کے جواب میں بجائے مَـا أَنَا عَلَيهِ کے سیدھی تعبیر یہ تھی کہ مَـا جِئتُ بِهٖ فرمادیا جاتا، یعنی معیارِ حق وہی ہے، جسے لے کر میں آیا ہوں یعنی شریعت؛لیکن اس شریعت کوشخصیتوں سے الگ

کر کے ذکر کرنے کے بجائے شخصیتوں کے انتساب سے ذکر کرنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ محض کاغذ کے کالے نقوش معیار نہیں ؛ بلکہ وہ ذوات معیارِ حق ہیں ، جن میں یہ نقوش وحروف ، اعمال واحوال بن کر رچ گئے ہیں اوراس طرح گھل مل گئے ہیں کہ اب کوئی بھی ان کی ذوات کو دین سے الگ کر کے اور دین کو ان کی ذوات سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتا ، جس کا حاصل یہ نکلا کہ محض لٹریچر معیارِ حق نہیں ؛ بلکہ وہ ذوات معیارِ حق ہیں ، جو اس لٹریچر کے حقیقی ظرف بن چکے ہیں :

بَل هُوَ آيَات بَيِّنَات فِي صُدُورِ الَّذِينَ أوتُوا العِلمَ وَمَا يَجحَدُ بِآيَاتِنَا الَّا الظٰلِمُونَ. [سورۃ العنکبوت :۴۹] ترجمہ : بلکہ یہ قرآن تو آیتیں ہیں صاف ، ان لوگوں کے سینوں میں جن کو سمجھ ملی ہے ، اور منکر نہیں ہماری باتوں سے ؛ مگر وہی جو بے انصاف ہیں ۔

پھر اس طریقہ کو شخصیت کی طرف منسوب کرنے کے سلسلہ میں بظاہر ''ما'' کے بعد ''انا'' کافی تھا اور یہ فرما دینا بہت تھا کہ نجات وہلاکت پہچاننے کا طریقہ میری ذات ہے ؛ تاکہ معیارِ حق صرف رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ثابت ہوتی ؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ اپنے صحابہ کو بھی شامل فرمایا ۔ جس سے واضح طور پر ثابت ہوجاتا ہے کہ فرقوں اور مختلف مکاتبِ خیال کے پرکھنے کا معیار جیسے رسول کی ذات ہے ، ویسے ہی صحابہ رسول کی ذوات بھی ہیں اور اس لیے رسولِ خدا کی موجودگی یا عدمِ موجودگی میں کسی فرقہ اور مکتب خیال کے افراد کو پرکھنے کے لیے یہ دیکھ لینا کافی ہے کہ وہ صحابہ کی راہ کے مطابق چل رہے ہیں یا مخالف سَمت میں ہیں ۔ ان کی اطاعت کر رہے ہیں یا اس سے گریز کر رہے ہیں ، ان کے ساتھ حسنِ ظن کا برتاؤ کر رہے ہیں یا سوءِ ظن اور بے اعتمادی کا ؟ کہ یہی شان کسی شئے کے معیار ہونے کی ہوتی ہے جس سے صاف طور پر رسولِ خدا کے ساتھ صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا معیارِ حق ہونا واضح ہوجاتا ہے اور یہ حدیث اس بارے میں نص صریح ثابت ہوتی ہے ، جس کا مقصد ہی یہ مدعا ثابت کرنا ہے ۔

اس کی وجہ یہ ہے جو خود اس حدیث ہی سے نمایاں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اپنے طریق کو بعینہٖ اپنے صحابہ کا طریق بتلایا ہے ، جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ ان کی راہ چلنا میری راہ چلنا ہے اور ان کی پیروی میری پیروی ہے ۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حق تعالیٰ شانہ نے اپنے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ مَن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدأطَاعَ اللّٰهَ. [سورۃ النساء :۸۰] جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی ۔

اس سے ایک کی اطاعت کو بعینہٖ دوسرے کی اطاعت بتلانا مقصود ہے ، جس کے صاف معنی یہی ہوتے ہیں کہ خدا اور اس کے رسول کا طریق الگ الگ نہیں جو رسول کا راستہ ہے وہی اللہ کا راستہ ہے ۔ پس اللہ کی اطاعت معلوم کرنے کا معیار یہ ہے کہ رسول کی اطاعت دیکھ لی جائے ، اگر وہ ہے تو بلاشبہ خدا کی

اطاعت بھی ہے ورنہ نہیں۔ وہی صورت یہاں بھی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کی پیروی اور اطاعت کو بعینہ اپنی پیروی اور اطاعت قرار دیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر رسول کی اطاعت دیکھنی ہو تو صحابہ کی اطاعت دیکھ لی جائے۔

اگر صحابہ کی متابعت کی جارہی ہے تو رسولِ خدا کی اطاعت قائم ہے ورنہ نہیں۔ اس کا حاصل وہی نکلتا ہے کہ رسول اور صحابہ رسول کے طریقے الگ الگ نہیں؛ بلکہ جو رسول کا طریقہ ہے وہی بعینہ صحابہ رسول کا طریقہ ہے، اس لیے جیسے رسول فرقوں کے حق و باطل ہونے کا معیار ہیں، ایسے ہی صحابہ رسول بھی معیارِ حق و باطل ہیں۔ جن کو سامنے رکھ کر سب کے حق و باطل کو بآسانی پرکھا جاسکتا ہے۔''

خلاصہ یہی ہے کہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا معیارِ حق و باطل ہونا کوئی قیاسی مسئلہ نہیں؛ بلکہ منصوص مسئلہ ہے۔ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حکیمانہ تشریح سے یہ بات بیّن طریقہ سے واضح ہوتی ہے کہ اہل السنۃ والجماعۃ کا مصداق وہ جماعت ہے جو کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماعِ صحابہ کو حجتِ شرعیہ مانتی ہو اور امت کا سوادِ اعظم اسی زمرہ میں آتا ہے؛ کیونکہ پوری دنیا میں زیادہ تر ائمہ اربعہ کے ماننے والے اور ان کے مقلدین ہیں، جو بالاتفاق اصولِ ثلاثہ کو حجت مانتے ہیں اور طریقہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ اقوالِ صحابہ، افعالِ صحابہ اور بالخصوص اجماعِ صحابہ کو دلیلِ شرعی مان کر اتباع کرتے ہیں اور صرف اتباع ہی نہیں؛ بلکہ سنت کا درجہ دیتے ہیں، خاص طور پر خلفاءِ راشدین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فیصلوں کو اتفاقی طور پر قبول کر کے عمل کرتے ہیں؛ کیونکہ حدیث شریف میں حضرات خلفاء راشدین کے طریقوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل اپنا طریقہ فرمایا ہے جیسا کہ حضرت حکیم الاسلام کی تحریر میں بہ وضاحت یہ مسئلہ آچکا ہے، اور ایک دوسری حدیث میں یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ مذکور ہے؛ ارشادِ نبوی ہے: عَلَيْكُم بِسُنَّتِيوَسُنَّةِ الخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ المَهدِيِّينَ تَمَسَّكُوا بِهَا وَعَضُّوا عَلَيهَا بِالنَّوَاجِذِ. [مشكوٰة المصابيح: ۳۰] تم لوگ میرے طریقہ اور رہنمائی کرنے والے اور راہ یافتہ خلفاء کے طریقہ کو لازم پکڑ لو اور اس کو مضبوطی سے تھام لو۔ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی خلفاءِ راشدین کے طریقوں اور ان کے اعمال و اقوال کو سنت رسول کے مساوی قرار دے رہے ہیں کہ دونوں پر سنت کا لفظ لانا اور پھر بہا میں ضمیر واحد لانا بتاتا ہے کہ حجت شرعیہ ہونے کی حیثیت سے دونوں میں فرقِ مراتب نہیں؛ بلکہ دونوں مساوی اور برابر ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوتا کہ اہل حق صرف اہل السنۃ والجماعۃ ہیں اور اہل السنۃ والجماعۃ کا صحیح مصداق ائمہ اربعہ کے مقلدین؛ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی حضرات ہیں اور جو حضرات تقلید کے قائل نہیں وہ اہل السنۃ والجماعۃ میں داخل نہیں؛ بلکہ خارج ہیں۔ حکیم الامت، مرشدِ ملت حضرت اقدس تھانوی مائۃ دروس میں درس نمبر ۵۹ رمیں

اس کی صراحت فرماتے ہیں:

ہمارے زمانے کے ان مذاہب کے بارے میں جو اسلام کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ اہلِ حق ان میں سے اہل السنۃ والجماعۃ ہیں جو قابلِ اعتماد لوگوں کے اجماع سے منحصر ہیں حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ میں۔ اور اہلِ ہواء ان میں سے ...... (۱) غیر مقلدین ہیں جو کہ اتباعِ حدیث کا دعویٰ کرتے ہیں؛ حالانکہ انھیں اس دعویٰ کا حق نہیں۔...... (۲) جاہل صوفی اور مبتدعین میں سے ان کے پیرو ہیں۔ اگرچہ بعض ان میں سے علماء کی صورت میں ہیں۔...... (۳) روافض۔...... (۴) نیچری جو کہ معتزلہ کے مشابہ ہیں؛ لہٰذا اے مخاطب تو ان سے بچ، ورنہ ان کی خواہش نفسانی سے پلید ہو جائے گا۔

مسلک علماءِ دیوبند:

علماءِ دیوبند صرف اہل السنۃ والجماعۃ کے اصول وقوانین ہی کے از اوّل تا آخر پابند رہے ہیں؛ بلکہ ان کے متوارِث ذوق کو بھی انھوں نے تھاما اور محفوظ رکھا ہے۔ پھر وہ خود رو قسم کے اہلِ سنت نہیں؛ بلکہ اوپر ان کا استنادی سلسلہ ملا ہوا ہے؛ اس لیے مسلک کے لحاظ سے نہ وہ کوئی جدید فرقہ ہیں اور نہ بعد کی پیداوار ہیں؛ بلکہ وہی قدیم اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلسل سلسلہ ہیں، جو اوپر سے تسلسل اور استمرار اور سند متصل کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ وقت کے عوامل اور افراط وتفریط نے چونکہ اہلِ سنت میں مختلف شاخیں پیدا کر دیں اور ہر نئی شاخ نے اصل ہونے کا دعویٰ کیا جو دعویٰ ہی کی حد تک نہیں رہا؛ بلکہ اپنے وجود وبقا کے لیے ہر شاخ نے اصل طبقہ کے خلاف محاذ بنا کر اسے غیر اصل اور اپنے کو اصل ثابت کرنے کی جدوجہد کا بھی آغاز کر دیا، جیسا کہ اصل سے کٹی ہوئی شاخوں کا یہی طرزِ عمل ہوتا ہے؛ اس لیے حقیقی اصل عوام کی نگاہوں میں مشتبہ ہونے لگی اور بہت سے سوالات اٹھنے لگے؛ مگر اصل بہر حال اصل ہی ہوتی ہے اور معیار پر کسنے کے بعد اس کی اصلیت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

پس علماءِ دیوبند کے جامع اور معتدل ترین مسلک کو سمجھنے کے لیے جس میں افراط ہے نہ تفریط، غلو ہے نہ مبالغہ؛ بلکہ کمالِ اعتدال اور جامعیت کا جوہر پیوست ہے۔ سب سے پہلے اس کے لقب کے ماخذ پر غور کر لیا جائے تو اسی سے اس کی بنیادیں واضح ہو جائیں گی اور معیار بھی مشخص ہو کر سامنے آجائے گا اور وہ یہ ہے کہ اہل السنۃ والجماعۃ کا یہ مرکب اور مسلکی لقب دو اجزاء سے مرکب ہے، ایک ''السنۃ'' اور دوسرا ''الجماعۃ'' ان دونوں کے مجموعہ ہی سے علماءِ دیوبند کا مسلک بنتا ہے تنہا ایک کلمہ سے نہیں۔ ''السنۃ'' کے لفظ سے اصول، قانون اور طریق نمایاں ہے اور ''الجماعۃ'' کے لفظ سے ذوات، شخصیات اور رفقاءِ طریق نمایاں ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس مسلک میں اصول وقوانین بغیر ذوات کے اور ذوات بغیر اصول وقوانین کے معتبر نہیں؛ جبکہ قوانین ان ذوات ہی کے راستے سے آئے ہوں اور ذوات ان قوانین ہی سے پہچانی گئی ہوں۔

اس لیے ماخوذ کو لے لیا جانا اور ماخذ کو چھوڑ دینا کوئی معتدل مسلک نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس امت کو قرآن کریم ہی نہیں دیا؛ بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بھی عطا فرمائی ہے، جنھوں نے قرآن کریم سنایا، سمجھایا اور اس کے عمل کا نمونہ دکھلایا۔ پس مسلک کی جامع حقیقت جس جامع لقب سے ظاہر کی ہے اس کے دونوں اجزاء قیاسی نہیں؛ بلکہ منصوص ہیں؛ کیونکہ ''السنۃ'' سے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک طریقہ مراد ہے جو حدیث شریف میں لفظ ''ما'' سے مفہوم ہو رہا ہے اور ''الجماعۃ'' کا لفظ اصحابی سے لیا گیا ہے؛ جبکہ ایک دوسری روایت میں جو امام احمد اور امام ابوداؤد نے نقل فرمائی ہے اس میں أنا و أصحابی کی جگہ صراحتاً وَهِيَ الجَمَاعَةُ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

مسلک علماءِ دیو بند کے اجزاءِ ترکیبی:

(۱)......عقیدۂ توحید: علماءِ دیو بند عقیدۂ توحید میں اعتدال قائم رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے توحید کا عقیدہ رکھنے کے ساتھ اہل اللہ کی عظمت وتوقیر اور اربابِ فضل وکمال کے ادب واحترام کو عقیدۂ توحید کے منافی سمجھنا مسلکِ دیو بند کا عنصر نہیں ہے۔ پس توحید میں لگ کر بے باکی، جسارت اور شخصیات کی عظمتوں سے بے نیازی ہمارا مسلک نہیں؛ بلکہ یہ توحید کا غلو ہے اور ایسے ہی تعظیمِ اولیاء اور توقیرِ شخصیات میں مبالغہ کرنا جس سے توحید میں خلل پڑتا ہو یا شرک کی آمیزش کر دینا بھی علماءِ دیو بند کا مسلک نہیں۔ بس توحید اس درجہ تک کہ تعظیم اہلِ دل متاثر نہ ہو اور تعظیم وتوقیر اس حد تک کہ توحید مجروح نہ ہو یہی راہِ اعتدال ہے جو مسلک دیو بند ہے۔

(۲)......صفاتِ باری تعالیٰ: صفاتِ خداوندی میں علماءِ دیو بند کا اصل مسلک تفویض ہے، یعنی جو صفات اللہ رب العزت نے خود اپنے لیے ثابت فرمائی ہیں مثلاً ''ید'' ارشاد ہے: يد اللّٰه فوق أيديهم اور ''استواء علی العرش'' ارشادِ باری ہے: الرحمن على العرش استوى (سورۃ طٰہٰ:۵) یا احادیث شریفہ میں وہ صفات اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کی گئی ہیں مثلاً ''ضحک'' حدیث شریف میں ہے: ان اللّٰه يضحك وغیرہ تو ایسے اوصاف کے سلسلہ میں علماءِ دیو بند کا مسلک یہ ہے کہ وہ تمام صفات اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں، اور یہ صفات مخلوقات کی صفات جیسی نہیں ہیں؛ کیونکہ خود اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ليس كمثله شيء. [سورۃ شوریٰ:۱۱] اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے: ولم يكن له كفوا أحد (سورۃ الاخلاص) اور کوئی اس کے برابر نہیں۔ اور ہمیں ان اوصاف کی کیفیت معلوم نہیں ہے بس وہ صفات اس کے لیے ثابت ہیں؛ البتہ علماءِ دیو بند ثانوی درجہ میں تاویل کی گنجائش دیتے ہیں وہ بھی چند شرطوں کے ساتھ:......[۱] لفظ میں وہ معنی مراد لینے کی گنجائش ہو،......[۲] وہ معنی مرادی شانِ الوہیت کے منافی نہ ہوں؛ بلکہ لائق اور مناسب ہوں......[۳] وہ

معنی کسی دوسری نص میں خدا تعالیٰ کے لیے ثابت ہوں...... [۴] تاویلی معنی کو حتمی اور قطعی باور نہ کیا جائے؛ بلکہ احتمال ہی کے درجہ میں رکھا جائے وغیرہ۔

(۳)......سید الکونین آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق علماءِ دیوبند کا مسلک اور عقیدہ (جو نہایت معتدل اور افراط وتفریط سے پاک ہے) یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سید الکونین، افضلِ کائنات، افضل البشر اور افضل الانبیاء؛ بلکہ امام الانبیاء ہیں؛ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشریت سے نکالنا ہمارا عقیدہ نہیں ہے کہ عقیدت ومحبت میں اندھے ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کی نفی کردیں ایسا نہیں ہے۔

(۴)......حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم: اس مسئلہ میں بھی مسلکِ دیوبند غلو اور افراط وتفریط سے بچ کر نقطۂ اعتدال کو اپنی راہ مقرر کرتا ہے کہ نہ تو غلو زدہ اور بے بصیرت لوگوں کی طرح کہ خدا اور انبیاء میں کوئی فرق نہیں صرف ذاتی اور عرضی کا فرق ہے (معاذ اللہ من ذلک) یا خدا ان میں حلول کیے ہوئے ہے اور وہ ایک پردۂ مجاز ہیں۔ یا وہ عام انسانوں سے الگ مافوق الفطرت کوئی دوسری مخلوق ہیں جن میں بشری نوع سے مماثلت نہیں وغیرہ گمراہ کن عقیدہ ہو، اور نہ ایسا ہے کہ وہ محض ایک ڈاکیا اور اخبار فروش کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا کام خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے اور بس! یعنی حضرات انبیاء علیہم السلام صرف سفیر محض کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں افراط وتفریط کے راستوں کے درمیان کا معتدل ترین راستہ علماءِ دیوبند کا اختیار کردہ ہے کہ یہ مقدس وپاکیزہ ہستیاں جہاں پیغامِ الٰہی کی امین ہیں کہ کمالِ دیانت اور نہایت حزم واحتیاط کے ساتھ خالق کا پیغام مخلوق تک پہنچایا ہے اس کے ساتھ اس کے رمز شناس، معلم اور اس کی روشنی میں خلق خدا کے مربی ومحسن بھی ہیں۔ پس وہ محسن عالم بھی ہیں، اخلاقِ انسانیت کا درس دینے والے شیوخ واساتذہ بھی؛ چنانچہ وہ ہر تعظیم وتوقیر اور ہر ادب واحترام کے مستحق ہیں؛ البتہ وہ بشر ہیں کوئی مافوق الفطرت مخلوق نہیں، انبیاء کی بے ادبی کفر ہے اور عظمت عینِ ایمان ہے؛ لیکن اس عظمت میں شرک کی آمیزش بھی کفر سے بڑھ کر کفر ہے۔

(۵)......حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین: صحابہ کرام کی جماعت وہ خوش بخت اور سعادت مند جماعت ہے جس کو کسبِ فیض کا موقع آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست اور بلا واسطہ نصیب ہوا ہے؛ لہٰذا یہ جماعت اور گروہ پورا کا پورا راشد ومرشد، راضی ومرضی، تقی القلب، پاک باطن، مستمر الطاعۃ، محسن وصادق اور موعود بالجنۃ ہے۔ پس اس جماعت کے تعلق سے علماءِ دیوبند کا مسلک وعقیدہ یہ ہے کہ عظمت وجلالت کے معیار سے صحابہ کرام میں تفریق نہیں ہے کہ کسی کو لائق محبت وعظمت سمجھیں اور کسی کو معاذ اللہ لائق عداوت، کسی کی مدح میں رطب اللسان ہوں اور العیاذ باللہ کسی کی مذمت میں زبان دراز کریں، کسی کو نبوت سے بھی اونچا مقام دینے پر اتر آئیں اور معصوم باور کریں اور کسی کے ساتھ سب وشتم اور قتل وغارت گری

کا معاملہ کرنے تک سے گریز نہ کریں، علماءِ دیوبند کہتے ہیں: کہ یہ سب حضرات تقدس کے انتہائی مقام پر ہیں؛ مگر نبی یا خدا نہیں! بلکہ بشریت کی صفات سے متصف، لوازمِ بشریت اور ضروریاتِ بشری کے پابند ہیں؛ لیکن ان سب کے باوجود زہد وتقویٰ میں کامل، فراست وبصیرت میں یکتا، معصیت وگناہ کے جذبات سے عاری، طاعات وعبادات میں بھاری، ایمان وتقویٰ سے ان کے قلوب آراستہ اور کفر وفسق سے ان کو کیا واسطہ، پس وہ غیر معصوم ہونے کے باوجود تنقید وتبصرہ سے بالاتر ہیں؛ کیونکہ وہ من جانب اللہ گناہوں سے محفوظ ہیں۔

(۶)......صوفیاءِ کرام اور مسلک علماءِ دیوبند: اولیاءِ کرام اور صوفیاءِ عظام کا طبقہ امت کے لیے روحِ رواں کی حیثیت رکھتا ہے، جس سے امت کی باطنی حیات وابستہ ہے، جو اصل حیات ہے، اس لیے علماءِ دیوبند ان کی محبت وعظمت کو ایمان کے تحفظ کے لیے ضروری سمجھتے ہیں؛ مگر غلو کے ساتھ محبت وعقیدت میں انھیں ربوبیت کا مقام نہیں دیتے۔ ان کی تعظیم شرعاً ضروری سمجھتے ہیں؛ لیکن اس کے معنی عبادت کے نہیں لیتے کہ انھیں یا ان کی قبروں کو رکوع وسجدہ طواف ونذر اور منّت وقربانی کا مقام اور محل بنالیا جائے۔ علماءِ دیوبند اولیاء اللہ کو مشکل کشا، حاجت روا، دافع البلاء والوباء نہیں مانتے ایسی شان صرف اللہ رب العزت کی ہے۔

(۷)......ایصالِ ثواب اور مسلکِ دیوبند: ایصالِ ثواب ایک مستحسن امر اور اموات کا حق ہے اس سلسلہ میں بھی نہ تو یہ صورت ہے کہ میت کی قبر پر کھانا رکھنا، چادر چڑھانا، چراغاں کرنا وغیرہ بیہودہ کاموں کے بارے میں نہ تو یہ نظریہ ہے کہ ان کاموں سے میت کو کوئی فائدہ حاصل ہوگا اور نہ ہی یہ عقیدہ ہے کہ مرنے والے کو دوسرے کے کسی عمل کا کوئی اجر وثواب نہیں پہنچتا؛ بلکہ علماءِ دیوبند نے ایک درمیانی اور معتدل راہ اپنائی ہے کہ میت کے لیے دعا واستغفار کرنا، صدقہ دینا، بلا اجرت قرآن کریم پڑھ کر ایصالِ ثواب کرنا، نفلی نماز، روزہ، حج وغیرہ کا ثواب میت کو پہنچانا جائز اور صحیح ہے؛ کیونکہ حدیث شریف میں مرنے کے بعد اعمال کا سلسلہ منقطع ہونے والی روایت میں صدقۂ جاریہ اور نفع بخش علم کے ساتھ اولادِ صالح کو شمار کیا ہے؛ مگر اس کی مخصوص صورتیں بنانے کے قائل نہیں! جیسے نیاز، فاتحہ، تیجہ، دسواں، بیسواں، چالیسواں اور برسی وغیرہ کے عنوانات ہیں۔

(۸)......تزکیہ نفس اور مسلک علماءِ دیوبند: تکمیل اخلاق اور تزکیۂ نفس کے لیے طریقت کے سلسلوں کے مطابق مشائخ سے بیعت وصحبت کو حق اور طریقت کے اصول وہدایات کی پابندی کو ضروری اور مفید کہتے ہیں؛ لیکن طریقت کو شریعت سے الگ کوئی مستقل راہ نہیں سمجھتے، جو سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہو؛ بلکہ شریعت ہی کے باطنی اور اخلاقی حصہ کو طریقت کہتے ہیں جو اصلاحِ قلب کا راستہ ہے اسی کو شریعت نے ''احسان'' کے لفظ سے ذکر کیا ہے؛ لہٰذا طریقت کے اصول وقوانین کو کتاب وسنت ہی سے ثابت شدہ جانتے ہیں اور اس لائن یعنی تصوف کی بے اصولیوں اور خود ایجاد کردہ رسم ورواج کو طریقت نہیں کہتے اور خلافِ سنت

ہونے کی وجہ سے قابلِ ترک؛ بلکہ مردود سمجھتے ہیں۔

(۹) فقہ وفقہاء اور مسلک دیوبند: فقہ وفقہاء کے سلسلہ میں بھی علماءِ دیوبند کا مسلک وہی جامعیت اور جوہرِ اعتدال لیے ہوئے ہے، کہ آزادیِ نفس سے بچنے، دینی بے قیدی اور خودرائی سے دور رہنے اور اپنے دین کو تشتت و پراگندگی سے بچانے کے لیے اجتہادی مسائل میں کسی متعین فقہ کی پابندی اور ایک ہی امام کے مذہب کے دائرہ میں محدود رہنا ضروری ہے؛ اس لیے علماءِ دیوبند فقہیات میں حنفی المذہب ہیں؛ ان میں افراط وتفریط نہیں ہے کہ نہ تو اسلاف کے قائم کردہ اصولِ تفقہ اور ان سے استنباط کردہ مسائل ہی کے قائل نہ ہوں اور ہر قدم پر اپنے فہم ورائے کی قطعیت کے تو ہم میں اجتہادِ مطلق کا دعویٰ لے کھڑے ہوں اور نہ اس کے برعکس فقہیات میں ایسے جمود اور بے شعوری کے قائل ہیں کہ ان فقہی مسائل کی تحقیق وتدقیق یا ان کے ماخذوں کا پتہ چلانے کے لیے کتاب وسنت کی طرف مراجعت کرنا بھی گناہ تصور کرنے لگیں! پس علماءِ دیوبند بلاشک وشبہ مقلد اور معین فقہ کے پابند ہیں؛ لیکن مقلد محقق ہیں جامد نہیں، تقلید ضرور ہے؛ مگر اندھی نہیں اور یہ بھی کمال کی بات ہے کہ شانِ تحقیق رکھنے کے باوصف پوری جماعت مجتہد ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی۔

(۱۰)......حدیث ومحدثین اور مسلکِ دیوبند: حدیث شریف؛ چونکہ کلامِ الٰہی کا بیان وتفسیر ہے اور دوسرے درجہ میں مصدرِ شریعت ہے؛ اس لیے علماءِ دیوبند کسی ضعیف سے ضعیف حدیث کو بھی چھوڑنے کے روادار نہیں ہیں، بشرطیکہ وہ قابلِ استدلال ہو، حتیٰ کہ متعارض روایات میں بھی اخذ وترک کا اصول نہیں اپناتے؛ بلکہ سب سے پہلی کوشش جمع بین الروایات اور تطبیق وتوفیق کی ہوتی ہے؛ تاکہ تمام روایات پر کسی بھی درجہ میں عمل ہوجائے؛ کیونکہ اہمال (بیکار چھوڑنے) سے بہرصورتِ اعمال (عمل کرنا) افضل ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اس سلسلہ میں طرزِ عمل یہ تھا کہ باب سے متعلق تمام روایات کو جمع فرماتے پھر مجموعہ پر غور فرماتے تھے کہ شارع علیہ السلام کی غرض کیا نکلتی ہے، اسی کو مناطِ حکم کی تخریج کرنا کہتے ہیں، پھر اس کی تنقیح وتجزیہ کرکے اس روایت کو اپنے مذہب کی بنیاد بناتے تھے جس میں شارع کی غرض سب سے نمایاں ہو، خواہ وہ روایت سنداً قوی ہو یا کچھ کمزور! پھر بقیہ روایات کو ترک کرنے کے بجائے غرضِ شارع اور مناطِ حکم کے معیار سے اس روایت کے ساتھ جوڑتے چلے جاتے ہیں جس میں غرض زیادہ واضح تھی، پس ساری روایات اپنے اپنے مواقع پر چسپاں ہوتی چلی جاتی ہیں۔

(۱۱)......علم کلام اور مسلکِ دیوبند: نصوصِ صریحہ سے ثابت شدہ عقائد تقریباً سب متفق علیہ ہیں، جو کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہیں؛ لیکن استنباطی یا فروعی عقائد، اسی طرح وہ قطعی عقائد جن کی کیفیات اور تشریحات میں اربابِ فن کے درمیان اختلافات ہیں، اس لحاظ سے اس فن میں بھی یکسوئی حاصل کرنے کے لیے علمِ کلام کے بابصیرت ائمہ میں سے کسی ایک کا دامن تھامنا اسی طرح ضروری ہے جس

طرح فقہ کے اجتہادی مسائل میں کسی امام کے مذہب کا پابند رہنا ضروری ہے، پس علماءِ دیوبند علم کلام میں تمام متکلمین کو برحق مانتے ہوئے اور سب کی عظمت کے ساتھ امام ابومنصور ماتریدیؒ کا اتباع کرتے ہیں؛ لیکن یہاں بھی معین کلام کی پابندی اور اتباع کے ساتھ تحقیق کا سرا ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ کلامی مسائل میں خصوصیت کے ساتھ حجۃ الاسلام، بانیِ دارالعلوم دیوبند حضرت اقدس مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی حکیمانہ تعلیمات سے ماخوذ قاسمیت غالب ہے۔ حضرت نانوتوی قدس سرہ اشاعرہ اور ماتریدیہ کے اختلافی مسائل میں ردوقدح کی راہ اختیار نہیں کرتے؛ بلکہ رفع اختلاف اور تطبیق وتوفیق کا راستہ اختیار فرماتے ہیں جس سے کلامی مسائل کا بڑے سے بڑا اختلاف نزاعِ لفظی محسوس ہونے لگتا ہے، اسی بنا پر اکابرِ دیوبند کلامی مسائل میں اشعری کہلاتے ہیں۔ علم کلام چونکہ مخالفین کے اٹھائے ہوئے شکوک وشبہات اور ان کے پیدا کردہ اشکالات واعتراضات کے جوابات دینے کے لیے وضع کیا گیا ہے اور چونکہ مخالفین اس سلسلہ میں عقل کا استعمال کرتے ہیں تو ان کے جوابات دینے کے لیے بھی ایسا ہی طریقہ ہونا چاہیے جس میں معقولات کی آمیزش رہے، پس علماء متکلمین بھی ایسے موقع پر عقل سے تعاون لیتے ہیں؛ لیکن عقل سے مدد لینے کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ نقل سے صرفِ نظر کرلیتے ہیں، اسی لیے علمِ کلام عقل ونقل کا سنگم بن گیا ہے پھر اس میں افراط وتفریط شروع ہوگئی کہ ایک طبقہ اور جماعت نے عقل کا مقام نقل سے بڑھا دیا، نقل کو عقل کے تابع کردیا کہ اصل حیثیت اور مقام عقل کو دے دیا، چنانچہ معتزلہ جیسی جماعتیں اسی نظریہ کی شکار ہوئی ہیں۔ اس کے ردِعمل میں کچھ اسلامی جماعتوں نے دین کے دائرہ میں عقل کے عمل، دخل کی کلی ممانعت کرڈالی اور عقل کو مذہب کی حد تک مہمل وبیکار اور لایعنی شئے قرار دے دیا کہ مذہب کا عقل یا معقولیت سے کوئی واسطہ نہیں، اور نہ ہی مذہبی کسی حکم میں کوئی عقلی مصلحت ملحوظ رکھی جائے گی۔ ان دونوں افراط وتفریط والے نظریات سے الگ ہٹ کر ایک معتدل اور جامع رائے ہے جو علماءِ دیوبند کا مسلک ہے کہ عقل کو مذہبی امور میں نہ تو مہمل اور دوراز کار سمجھتے ہیں؛ کیونکہ احکام کی عقلی مصلحتوں، کلی علتوں اور جامع حقیقتوں سے نصوصِ شرعیہ بھری پڑی ہیں اور جگہ جگہ اثباتِ مسائل، اجتہادِ مسائل، استخراجِ مسائل اور استنباطِ حقائق میں امورِ معقولہ کی تاثیر نمایاں ہے اور ان امورِ معقولہ کی ضرورت ناقابل انکار ہے، اور نہ عقل کو اس درجہ مستقل مانتے ہیں کہ وہ وحی کے مقابلہ میں اصل ہو، ثواب وعقاب کا استحقاق بھی اسی کے فتویٰ پر دائر ہو؛ چنانچہ مسلک دیوبند میں عقل کارآمد ہونے کے باوجود حاکم یا موجد ثمرات واحکام نہیں، وہ مسائل وعقائد کے اثبات کا آلہ ہے، یعنی علماءِ دیوبند عقل کو کارآمد اور مؤثر مانتے ہیں؛ لیکن بحیثیت خادم، حاکم کی حیثیت سے نہیں، مثلاً عقل دین میں تدبر وتفکر کا ایک آلہ ہے جس سے مخفی حکمتوں اور حقائق کا سراغ لگایا جاتا ہے، یہ حکمتیں اور حقائق عقل سے وجود میں نہیں آتے۔ عقل محسوسات کے ناپ تول کرنے کی ترازو ضرور ہے؛ مگر مغیبات کے علم وادراک کو محسوس کرنے والی نہیں، مسلکِ دیوبند میں دین ومذہب کی اصل وحیِ

خداوندی ہے اور اس کے اثبات کے خدام میں سے ایک خادم عقل بھی ہے۔

(۱۲)......حضرات انبیاء علیہم السلام اور حیاتِ برزخی: حبیبِ کبریا، شافعِ محشر، شاقیِ کوثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد عالم برزخ میں حضرات انبیاء اور بالخصوص سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اپنی مبارک قبروں میں باحیات ہیں، پھر وہ حیات کس انداز کی ہے؟ اس مسئلہ میں بھی امت کے اندر افراط وتفریط کا معاملہ ہے کہ کچھ حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام چونکہ نور ہیں، انسان یا بشر نہیں؛ اس لیے ان مقدس اور پاکباز ہستیوں پر موت طاری نہیں ہوتی؛ اس لیے تمام انبیاء بشمول آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مبارک قبروں اور مقدس روضوں میں بعینہ اسی حیات کے ساتھ آرام فرما ہیں جو دنیا میں حاصل تھی۔ صرف عام انسانوں سے پردہ فرمالیا ہے۔ اور دوسرا نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے کہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی موت عام انسانوں کی طرح ہے۔ پس جس طرح غیر انبیاء کی روحوں کا تعلق جسم سے نہیں رہتا اور قبر کے تمام احوال کا تعلق صرف روح سے رہتا ہے اور جسم گل کر مٹی ہو جاتا ہے بعینہ یہی صورت (العیاذ باللہ) تمام انبیاء اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم و روح کے ساتھ بھی ہے، یہ دونوں نظریے حدّ اعتدال سے دور اور افراط وتفریط کے شکار ہیں۔ پس راہ اعتدال اور صراطِ مستقیم (سب سے سیدھا راستہ) علماء دیوبند کا اختیار کردہ اور پسند فرمودہ راستہ ہے کہ نہ تو ایسا ہے کہ انبیاء پر موت بالکل اثر نہیں کرتی، اور حضراتِ انبیاء اپنی قبروں میں بالکل حیاتِ دنیاوی کے ساتھ آرام فرما ہیں؛ کیونکہ اس نظریے کی بنیاد ہی ایک بے بنیاد اصل پر ہے کہ حضراتِ انبیاء بشر نہیں، نور ہوتے ہیں۔ اور نہ ہی وہ دوسرا نظریہ کہ موتِ انبیاء بالکل عام انسانوں کی سی ہے؛ بلکہ عالم برزخ میں روح کا تعلق ایک تو عام انسانوں کا ہے۔....دوسرے درجہ میں شہداء ہیں جن کے بارے میں قرآن ناطق ہے کہ وہ زندہ ہیں، مردہ نہیں، یعنی ان کا جسم مٹی سے متاثر نہیں ہوتا، اور بہ سلامت رہتا ہے جیسا کہ نصوص اور مشاہدہ اس کے شاہد ہیں۔ اور حضرات انبیاء کی حیاتِ برزخی شہداء سے بھی زیادہ ہے یعنی نیند کی حالت میں جسم سے روح کا تعلق جس قدر ٹوٹتا ہے، حضرات انبیاء کی حیاتِ برزخی میں اس سے کچھ زیادہ ٹوٹتا ہے! لہٰذا حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیات برزخی میں حیات کے آثار عام انسانوں اور شہیدوں سے بھی زیادہ ہوتے ہیں؛ اسی لیے دنیاوی زندگی کے کچھ آثار بھی کسی درجہ میں باقی رہتے ہیں کہ اُن کی ازواج سے مناکحت کی اجازت نہیں ہوتی، اور ان کے اموال میں وراثت جاری نہیں ہوتی وغیرہ۔ یہ سب چیزیں دلالت کرتی ہیں کہ حضراتِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مبارک قبروں میں باحیات ہیں جو دنیاوی حیات سے گو کچھ کم درجہ کی ہے، پر عام انسانوں جیسا معاملہ بھی نہیں ہے۔

[تلخیص از مسلک علماءِ دیوبند مع اضافہ]

[بشکریہ: ماہنامہ دار العلوم، دیوبند]

مولانا محمد ظفر اقبال، کراچی

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا احسانی وعرفانی مقام

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی زندگی اتنی ہمہ جہات اور متنوع اوصاف وکمالات سے مملو ہے کہ اگر ان کی بابرکت زندگی کے کسی ایک ہی گوشے کو موضوع بنا کر اس پر لکھا جائے تو مختلف عنوانات پر ایک ایک بسیط مقالہ تیار ہوسکتا ہے۔ اس حقیقت کے برعکس یہ بات بھی بہت قابل مشاہدہ ہے کہ آزادئ ہند کی مختلف تحریکات میں قائدانہ اور جاں فروشانہ شمولیت نے شیخ الہندؒ کی عظیم شخصیت کو جہاد، سیاسیات اور تحریکات میں قیادت کا استعارہ بنادیا ہے۔ بلاشبہ شیخ الہندؒ کی میدان جہاد وتحریکات میں خدمات اس لائق ہیں کہ منصب امامت اور نقش ہدایت کے لیے برعظیم میں سید احمد شہیدؒ کے بعد اگر کسی شخصیت کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ بجا طور پر صرف شیخ الہند محمود حسنؒ ہیں ـــــ جہاں اس تکرار وگردان اور تحقیق وتفتیش نے میدان جہاد، تحریکات، زندان واسیری کے ایام میں شیخ الہندؒ کی حیات کے تقریباً ہر گوشے کو منظر عام پر لاکر اس باب میں اتباع کی بڑی راہ فراہم کی ہے اور اخلاف کو سلف کے طریق جہاد وسیاست کی ایک محفوظ راہ دکھائی ہے، وہیں اس عمل اور رویّے سے، لاشعوری طور پر ہی سہی لیکن، شیخ الہند کی زندگی کے بہت سے باطنی، احسانی، عرفانی، اخلاقی، سماجی اور تعلیمی پہلو نظر انداز ہوگئے ہیں، یا اس طرح واضح ہوکر منصۂ شہود پر نہیں آسکے کہ ان سے بلا تحقیق و تفحص رہنمائی لی جاسکے ـــــ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اگر شیخ الہندؒ کی زندگی کا بہ نظر امعان مطالعہ کیا جائے تو آپ کی شخصیت علم وفضل، درس وتدریس، افتا وتصنیف، مناظرے ووعظ اور سلوک وعرفان میں بھی جہادی اور تحریکی سرگرمیوں ہی کی طرح جامع اور منصب امامت پر فائز نظر آئے گی۔

استحضار الٰہی اور جذبہ عبودیت: لازمۂ احسان:

زیر نظر تحریر میں شیخ الہندؒ کے احسانی وعرفانی مقام کا ایک اجمالی جائزہ مقصود ہے۔ احسان وعرفان سے مراد وہ مواجید واحوال نہیں جنھیں فی زمانہ عرفان واحسان کا لازمہ باور کیا جاتا ہے، اگرچہ وسائل اور ذرائع کے درجے میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن یہاں احسان سے مراد بندگی کی وہ خاص اور متعین صورت ہے جو انسان کی کل زندگی کا احاطہ کرکے اس میں استحضار خداوندی اور جذبہ عبودیت پیدا کردیتی ہے ـــــ یہی عبودیت یا بندگی تمام تر فضائل واحسان کی بنیادی صفت ہے۔ غور کیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے القاب میں سب سے بڑا لقب عبدہٗ ہے۔ اور عارفین نے سب سے بڑا مقام عبدیت ہی کا بتلایا

ہے۔امام رازیؒ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ شب معراج اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کوکون سالقب ووصف سب سے زیادہ پسند ہے،تو آپؐ نے فرمایا:عبدیت ـــــ اسی لیے سورۃ اسراء میں آپ کا یہی پسند کردہ لقب نازل ہوا۔[1] بندگی کا جذبہ اگر ذہن، ارادے اور طبیعت میں راسخ ہوجائے تو زندگی کا ہر میلان، ہر فعل اور ہر تأثر بندگی کی کیفیت سے معمور ہو جاتا ہے اور عبودیت اور استحضار الٰہی انسان کا ''حال'' بن جاتی ہے۔انسان نیت، ارادے، شعور اور عمل ہر سطح پر تفویض اور سپردگی کے مقام پر پہنچ جاتا ہے ـــــ اسی استحضار الٰہی کے مراقبے اور خوشنودئ رب کی جستجو کو عارفین ''اخلاص'' سے تعبیر کرتے ہیں، جس سے انسان کے ذاتی اوصاف میں اگر ایک طرف خاک ساری وخود احتسابی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو دوسری جانب اس کے اعمال واحوال میں برکت اور تھوڑے عمل کی بڑی جزا مرتب ہوتی ہے۔جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

رب اشعث مدفوع بالابواب لو اقسم علی اللّٰہ لآبرہٗ.[2]

''بہت سارے پریشان حال پراگندہ حال، گرد وغبار سے اٹے ہوئے بالوں والے ایسے ہیں جنھیں دروازوں پر دھکیلا جائے، مگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اعتماد پر اگر وہ قسم کھابیٹھیں تو اللہ ان کی قسم کو سچا کر دکھائے''۔

شیخ الہندؒ: ذات اور علم کی عینیت:

شیخ الہندؒ کا درس حدیث ہندوستان میں معروف تھا، چالیس سال تک آپ نے دار العلوم دیوبند کی مسند تدریس سے **قال اللّٰہ وقال الرسول** کی صدائے دل نواز لگائی۔آپ کی زبردست شخصیت کے باعث دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے طلبأ کی تعداد ۲۰۰ر تک پہنچ گئی۔آپ کے زمانے میں ۸۶۰ر طلبأ نے حدیث نبویؐ سے فراغت حاصل کی۔شیخ الہندؒ کے تذکرہ نگار آپ کے درس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حلقۂ درس دیکھ کر سلف صالحین واکابر محدثین کے حلقۂ حدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا۔قرآن و حدیث حضرت کو ازبر تھے۔اور ائمہ اربعہ کے مذاہب زبان پر۔صحابہؓ و تابعین، فقہا و مجتہدین کے اقوال محفوظ۔تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتی تھیں، نہ منہ میں کف آتا تھا، نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو ادق اور بھدی بناتے تھے۔نہایت سبک اور سہل الفاظ بامحاورہ اردو میں اس روانی اور تسلسل سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا تھا دریا امنڈ رہا ہے۔یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے، اب بھی کئی دیکھنے والے موجود ہوں گے کہ وہی منحنی جسم اور منکسر المزاج ایک مشت استخوان، ضعیف الجثہ مرد خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا اور بارہا مسجد کے فرش پر بلا کسی بستر کے لیٹا ہوا نظر آتا تھا، مسند درس پر تقریر کے وقت یوں

معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر خدا ہے، جو قوت وشوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے''۔[۳]

معروف مستشرقہ باربرا مٹکاف [Barbara Metcalf] آپ کی تدریسی خصوصیات کے متعلق لکھتی ہیں:

> **He was a man of extraordinary energy, teaching ten lessons each day, writing, caring for Muhammad Qasim in his final illness. He was devoted to the school and resisted all invitations to leave it. His fame was especially great in hadith; and his biographer notes, in the course of his career he taught over a thousand students from such distant places as Kabul, Qandahar, Balkh, Bukhara, Mecca, Medina and Yeman. Among them were Anwar Shah Kashmiri, Shabir Ahmed Osmani and Hafiz Muhammad Ahmad, the Leaders of the third generation of ulama at the school.**[۴]

حافظے اور استحضار کا یہ عالم تھا کہ ''شیخ الہندؒ نے ایک مرتبہ کتابیں دھوپ میں رکھنے کے لیے باہر نکالیں۔ اتفاق سے میبذی کے کچھ ورق پھٹ گئے۔ حضرت نے ایک طالب علم سے کہا اس کو لکھ لو۔ اس نے کہا کیسے لکھوں میرے پاس وہ کتاب ہی نہیں۔ فرمایا، اچھا! سال گزشتہ پڑھی، امسال بھول گئے۔ پھر فرمایا، اچھا لکھو میں بولتا ہوں، چناں چہ زبانی لکھوا دیا''۔[۵]

اس مقام پر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ حافظے اور استحضار کی لیاقت عارفین کی تصریحات کے مطابق حلال رزق اور نظروں کی حفاظت سے مشروط ہے، جس سے شیخ الہندؒ پوری طرح بہریاب تھے ـــــ علم اور شیخ الہندؒ میں اسی عینیت کو آپ کے شیخ و مربی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ایک مختصر سے فقرے میں سمیٹ کر بیان کر دیا ہے کہ: ''محمود علم کا کٹھلا ہے''۔[۶] علم وفضل کی یہ لیاقت اور درس و تدریس کی اس شان کے باوجود شیخ الہندؒ کی بے نفسی اور فنائیت ایسی تھی کہ خود فرماتے ہیں:

> ''میں بارہا گنگوہ حاضر ہوا اور جی میں بھی آیا کہ حضرت مولانا [گنگوہیؒ] سے عرض کر دوں کہ مجھے بھی حدیث کی سند دے دیجیے، لیکن کبھی اس درخواست کی ہمت نہ پڑی۔ جب اس نیت سے گیا تو یہی خیال ہوا کہ تو یہ تمنا لے کر تو جاتا ہے، لیکن تجھے کچھ آتا جاتا بھی ہے؟ بارہا خیال ہوا کہ عرض کروں کہ سب کو حضرت سند دیتے ہیں، مجھے بھی سند دیجیے، مگر پھر خیال ہوا کہ مولانا پوچھ بیٹھیں کہ تجھے کچھ آتا بھی ہے، جو سند لیتا ہے؟ تو کیا جواب دوں گا؟ اس لیے کبھی درخواست کی ہمت نہ ہوئی''۔[۷]

چلیے! تھوڑی دیر کے لیے استاذ اور شیخ کے سامنے، اور وہ بھی مولانا گنگوہیؒ جیسے استاذ و شیخ کے رو بہ رو اس

خاک ساری کی توجیہہ کی جاسکتی ہے ـــــــ لیکن مولانا محمد شاہ رام پوریؒ تو معاصر تھے۔ان کے سامنے خاکساری کا اظہار! واقعہ ملاحظہ فرمایئے یہ وہ ہی شخص کرسکتا ہے جس کا نفس مزکی ہو چکا ہو۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ثقات سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ مرادآباد میں وعظ کی درخواست کی گئی، بہت کچھ عذر کے بعد منظور فرمایا اور بیان شروع ہوا۔حدیث یہ تھی **"فقیہ واحد اشد علی الشیطن من الف عابد"** کے ترجمے کا حاصل ''بھاری'' لفظ سے فرمایا،[کہ ایک فقیہہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے]، مجلس میں ایک پرانے عالم تھے جو محدث کے لقب سے معروف تھے۔انھوں نے کھڑے ہوکر فرمایا کہ ''اشد'' کا ترجمہ غلط کیا گیا، ایسے شخص کو وعظ کہنا جائز نہیں۔تو مولاناؒ بے ساختہ کیا فرماتے ہیں کہ حضرت! مجھ کو تو پہلے سے معلوم ہے کہ مجھ جیسے شخص کو وعظ کہنا جائز نہیں اور میں نے ان صاحبوں سے اسی واسطے عذر بھی کیا تھا، مگر انھوں نے مانا نہیں، اب بہت اچھا ہوا حضرت کے ارشاد سے بھی میرے عذر کی تائید ہوگئی اور بیان سے بچ گیا۔ حاضرین کو تو جس قدر ناگواری ہوئی اس کا کچھ پوچھنا نہیں، دانت پیستے تھے کہ یہ کیا لغو حرکت تھی، گو مولاناؒ نے بجائے ناگوار سمجھنے کے یہ کمال کیا کہ نہایت سکون کے ساتھ ان کے پاس جاکر ان کے سامنے ادب سے بیٹھ کر نہایت نیاز مندی کے لہجے میں ارشاد فرمایا کہ حضرت غلطی کی وجہ معلوم ہوجائے تو آئندہ احتیاط رکھوں۔انھوں نے کڑک کر فرمایا کہ **"أشد"** کا ترجمہ آپ نے **أثقل** سے کیا یہ کہیں منقول نہیں، **أضر** سے کرنا چاہیے۔مولاناؒ نے فرمایا اگر کہیں منقول ہو تو؟ انھوں نے کہا کہاں ہے؟ مولاناؒ نے فرمایا حدیث وحی میں ہے کسی نے پوچھا: **کیف یاتیک الوحی** [آپؐ پر نزول وحی کی کیفیت کیا ہوتی تھی؟] جواب میں ارشاد ہوا: **یاتینی أحیانا مثل سلسلة الجرس وھو أشده علی** [کبھی وحی مجھ پر گھنٹیوں کی آواز کی طرح آتی ہے اور وہ مجھ پر سب سے زیادہ بھاری ہوتی ہے] اور ظاہر ہے کہ یہاں **أضر** [زیادہ نقصان دہ] کے معنی ممکن نہیں **أثقل** [زیادہ بھاری] ہی کے معنی صحیح ہوسکتے ہیں۔بس یہ سن کر ان کا تو رنگ فق ہوگیا۔مگر مولاناؒ نے نہ کچھ اس پر فخر کیا نہ دوبارہ بیان شروع فرمایا''۔[8]

شیخ الہندؒ: فیض قاسمی کا شجرۂ طوبیٰ: خاکساری کا نتیجہ:

للّٰہیت اور خاکساری کے یہی وہ اوصاف تھے جس نے شیخ الہندؒ کو ترک ذات کے مقام علیا تک پہنچادیا تھا۔اس لیے خدا کا وعدہ ہے کہ جو تواضع اختیار کرے گا ہم اسے رفعت عطا کریں گے ـــــــ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ شیخ الہندؒ کے اسی وصف پر روشنی ڈالتے ہوئے، مولانا قاری محمد طیبؒ کے نام گرامی نامے میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے تو تنکے سے کام لیتا ہے اور پہاڑ رہ جاتا ہے۔حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ اور

مولانا عبدالعدل صاحبؒ، حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ العزیز کے شاگردوں میں سب سے زیادہ ذکی حفظ اور ذہن وغیرہ میں اعلیٰ درجہ رکھنے والے تھے۔ مولانا احمد حسن امروہویؒ دوسرے درجے میں تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عنایت بھی ان پر سب سے زیادہ تھی۔ ہمارے آقا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ان سب میں گرے ہوئے شمار کیے جاتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے سے جو کام لیا وہ ان میں سے کسی سے نہیں ہوا اور نہ ہو سکا۔ آج فیض قاسمی عالم میں میزابِ محمودی سے جاری ہے''۔[9]

شیخ الہندؒ کے مزاج وطبیعت میں اخفا کا بھی غلبہ تھا، اپنے علم وفضل کے اخفا کے حوالے سے آپ ہو بہ ہو اپنے استاذ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ہم رنگ وآہنگ تھے۔ مولانا نانوتویؒ کا یہ مقولہ بہت ہی معروف ہے کہ ''اس علم نے خراب کیا، ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا''۔[10] ـــــــ یہی فقرہ شیخ الہند سے اپنے متعلق منقول ہے:

''اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم سے نہ نوازا ہوتا تو اپنے کو اس قدر مٹاتے کہ محمود نام کا کوئی رہ نہ جاتا''۔[11]

لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی تواضع کی برکت سے آپ کے نام کو رہتی دنیا تک کے لیے علم وفضل سے لے کر حریت اور جہاد تک ہر جگہ نمایاں فرما دیا۔

ذوقِ عبادت اور حسنِ معاشرت: اساسِ بندگی:

عبودیت اور بندگی کو دو بنیادی اوصاف: ذوقِ عبادت اور حسنِ معاشرت کے بلیغ عنوانات میں سمویا جا سکتا ہے۔ عبادت، بندگی کا لازمہ اور تخلیق کی وجہ اصل ہے۔ لیکن ضابطے کی عبادت اور ذوقی عبادت میں بہت فرق ہے۔ عبادت کا ذوق اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جس کے لیے عبادت دل کا سکون اور لذت و فرحت کا سامان بن جائے۔ عبادت کے دو بنیادی مظاہر ہیں: تلاوت اور نماز ـــــــ ایسا شخص جسے ذوقِ عبادت حاصل ہو تلاوت اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا ذریعہ بن جاتی ہے اور نماز مخاطبت کا۔ اذکار و اوراد کی کثرت اور اس پر استمرار سے مقامِ عبودیت کو رسوخ کامل حاصل ہوتا چلا جاتا ہے۔

شیخ الہندؒ: باجماعت نماز اور نوافل کا غیر معمولی اہتمام:

واقفین حال شہادت دیتے ہیں کہ شیخ الہندؒ کے لیے ذکر، تلاوت اور نماز طبیعت ثانیہ بن گئی تھیں ـــــ عبادت کی خشت اول نماز باجماعت کی پابندی ہے جس کی عادت رفتہ رفتہ عبادت بن جاتی ہے۔ مولانا عزیز الرحمٰن بجنوریؒ لکھتے ہیں:

''صلوٰۃ باجماعت کا تو اس قدر اہتمام تھا کہ تکبیر اولیٰ تک فوت نہ ہوتی''۔[12]

ذوقِ عبادت کا یہ وافر حصہ شیخ الہندؒ کو زمانہ طالب العلمی ہی میں عطا ہوا تھا۔ باجماعت نماز کے علاوہ

صلوٰۃ اللیل اور دیگر اوراد و وظائف سے متعلق مولانا میاں سید اصغر حسینؒ لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا [محمود حسن] ایام طالب علمی ہی سے قیام لیل کے پابند تھے ...... دن کو تعلیم و تعلّم کا شغل رہتا تھا، رات کو ادائے اوراد و اذکار معمولۂ مشائخ اور تعلیم فرمودۂ حضرت استاذ کا، شب کو دس گیارہ بجے تک حضرت استاذ [مولانا محمد قاسم نانوتویؒ] کی خدمت میں رہتے اور اس کے بعد گاہ گاہ رات کو مطالعہ و سبق دیکھتے۔ ذرا آرام کر کے نوافل اور ذکر اللہ میں مصروف ہو جاتے''۔ [13]

عبادات و معمولات میں تستّر و اخفا کا عالم یہ تھا کہ پوری کوشش فرماتے کہ کسی کو آپ کے معمولات کی خبر نہ ہو۔ مولانا عزیز الرحمٰن بجنوریؒ لکھتے ہیں:

''صلوٰۃ اللیل سے تو گویا آپ کو عشق تھا۔ جب دیکھا کہ سب سو چکے ہیں، چپکے سے اٹھے اور نماز کی نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ طویل طویل رکوع اور قیام میں پوری پوری رات گزار دیتے، لیکن جہاں کہیں بھی ذرا سی آہٹ محسوس کرتے کہ کوئی جاگ رہا ہے، فوراً ہی لیٹ جاتے تا کہ دیکھنے والے کو یہ احساس ہو جائے کہ حضرت سو رہے ہیں''۔ [14]

کسی بے تکلف نے ایک مرتبہ شیخ الہندؒ سے یہ دریافت کر لیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ لوگوں کے جاگ جانے کے خیال سے نماز کیوں توڑ دیتے ہیں؟ فرمایا:

''بھائی! نفلی نماز کو توڑنے کے بعد دوسرے وقت ان کی قضا میرے لیے زیادہ سہل ہے اور بہتر ہے اس سے کہ لوگ میرے بارے میں حسن ظن رکھیں اور واقع میں میں ایسا نہ ہوں''۔ [15]

شیخ الہندؒ: کثرت عبادت کے باعث پاؤں کے ورم پر خوشی:

ایک مرتبہ کثرت عبادت کی بنا پر پاؤں ورم کر گئے تو اس پر خوش ہو کر فرمایا، ایک سنّت [**حتی تورمت قدماہ** ''حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم ہائے مبارک کثرت قیام کی بنا پر ورم کر جاتے تھے''۔] پر آج اتباع نصیب ہوا''۔ [16]

اتباع سنت: مجاہدات سلوک کا نقطۂ منتہا و مقصود:

اتباع سنت تمام تر مجاہدات اور سلوک و عرفان کا پھل ہے۔ شیخ الہندؒ کی اتباع سنت کا یہ عالم تھا کہ:

''قیام دیوبند کے دوران جمعے کے روز دیوبند سے باہر نہر پر تشریف لے جاتے، کپڑے دھوتے، پھر غسل فرماتے، یہاں تک کہ کپڑے پھریرے اور پہننے کے قابل ہو جاتے تو پہن کر ایسے وقت چلتے کہ جمعے کی اذان ہونے لگتی اور اذان سنتے ہی ایک دوڑ لگاتے کہ آیت کریمہ: **اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ** [جب نماز جمعہ کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف سعی کرو] پر عمل ہو سکے''۔ [17]

شیخ الہندؒ: عبادت اور اطاعت کا مظہر کامل:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

رأس الأمر فالاسلام وأما عموده فالصلوٰة وأما ذروة سنامه فالجهاد. [۱۸]

''اس چیز [دین] کا سر اسلام ہے، اس کے ستون نماز اور اس کوہان کی بلندی جہاد ہے''۔

بندگی کی غایت اصلی کے دو بڑے مظاہر ہیں: نماز اور جہاد ـــــ بندگی کے تشکیلی عناصر کا دائرہ ان ہی دو قوسوں سے مکمل ہوتا ہے ـــــ یہ دونوں مظاہر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہی نہیں عین یک دیگر ہیں اور غایت ان کی ایک ہے: بندگی ـــــ نماز عبادت الٰہی کا مظہر کامل ہے اور جہاد نیابت الٰہی کا۔ شیخ الہندؒ کی زندگی میں بندگی کے یہ دونوں مظاہر پوری شان سے جلوہ گر تھے۔ جہاد سے وابستگی ہی نے انھیں ''اسیر مالٹا'' بنایا تھا اور نماز جسے متذکرہ حدیث میں عبادت کے استعارے کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اس میں انہماک کا عالم یہ تھا کہ فرائض تو فرائض ہی تھے شیخ الہندؒ کے معمولہ نوافل، اوراد و اذکار اور معمولات کی اس پابندی میں نہ درس و تدریس کی مشغولیت رکاوٹ بنتی تھی نہ ہی تحریک و جہاد کی مصروفیت ـــــ حتیٰ کہ ایام اسیری میں بھی شیخ الہند معمولات اپنی ترتیب کے مطابق انجام دیتے رہے۔ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا عشا کی نماز کے بعد بہت تھوڑی دیر جاگتے تھے کچھ اپنے اوراد پڑھتے تھے اور پھر پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کر وضو فرماتے۔ کبھی کبھی باتیں بھی کرتے تھے اور پھر سو جاتے تھے کیوں کہ دس بجے کے بعد حکماً روشنیاں بجھا دی جاتی تھیں۔ جہاں دس بجے اسی وقت سپاہی آواز دیتا تھا۔ سب چراغ اور موم بتیاں بجھانی پڑتی تھیں اور پھر تمام شب جلانے کی اجازت نہ تھی۔ جہاں جہاں کمروں میں برقی روشنیاں تھیں وہاں خود ہی بجھ جاتی تھی۔ البتہ پھر وہ برقی روشنیاں جو کیمپ اور راستوں کی روشنی کے لیے تھیں وہ تمام رات جلا کرتی تھیں ان کا تار برقی کمروں کی روشنی کے تار سے علاحدہ تھا۔ الغرض دس بجے سے سب لوگ سو جاتے تھے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ تقریباً ایک بجے یا ڈیڑھ بجے شب کو اٹھتے اور نہایت دبے دبے پیروں سے نکلتے دروازے سے باہر تشریف لاتے۔ پیشاب سے فارغ ہو کر وضو فرماتے، گرمیوں میں تو گرم پانی کی ضرورت ہوتی ہی نہ تھی۔ نل کا پانی مناسب ہوتا تھا۔ سردی کے زمانے میں ہم نے یہ خاص اہتمام کیا تھا کہ چولہے پر کھانے کے بعد ایک بہت بڑے ٹین کے لوٹے میں جو کہ چائے کے لیے گورنمنٹ کی طرف سے ملتا اور اس میں ٹینٹو پیچ دار لگی ہوئی تھی۔ اور اس میں ہمارے معمولی دس بارہ لوٹے پانی آ جاتا تھا۔ پانی خوب گرم کر لیا جاتا تھا اور پھر اسی پاس والے کمرے میں جہاں پر نل لگا ہوا تھا۔ اس لکڑی کے تخت پر جس پر سب کپڑے دھوتے تھے ایک کمبل میں لپیٹ کر عشا کے بعد رکھ دیتے تھے۔ یہ پانی صبح تک خوب گرم رہتا

تھا۔ حال آں کہ سردی بہت ہی زیادہ پڑتی تھی۔ اندھیرے ہی میں جا کر اس میں نمازِ تہجد ادا فرماتے تھے۔ جب اس سے فارغ ہو جاتے تو پھر چارپائی پر آ کر بیٹھ جاتے تھے اور صبح تک مراقبہ اور ذکرِ خفی میں مشغول رہتے تھے اور ہزار دانوں کی تسبیح ہمیشہ سرہانے رکھی رہتی تھی۔ اسمِ ذات کی کوئی مقدار معین کر رکھی تھی اس کو ہمیشہ بالتزام پورا فرماتے۔ مراقبے کا اس قدر انہماک ہو گیا تھا کہ بعض اوقات میں دو دو تین تین مرتبہ باتیں دھراتے مگر سمجھتے نہ تھے۔ صبح کی نماز سے پیش تر اکثر پیشاب کرتے اور وضو کی تجدید فرما کر نماز باجماعت ادا فرما کر وہیں مصلےٰ [سجادہ] پر آفتاب کے بلند ہونے تک مراقب رہتے تھے۔ اس کے بعد اشراق کی نماز ادا فرما کر اپنے کمرے میں تشریف لاتے۔ اس وقت مولانا کے لیے ابلے ہوئے انڈے اور چائے تیار رہتی تھی۔ وہ پیش کر دی جاتی تھی۔ اس کو نوش فرما کر دلائل الخیرات اور قرآن شریف کی تلاوت فرماتے تھے۔ اس سے فارغ ہو کر کچھ ترجمۂ قرآن شریف تحریر فرماتے یا اس پر نظرِ ثانی کرتے یا اگر خط لکھنے کا دن ہوتا تو خط تحریر فرماتے یا وحید کو سبق پڑھاتے، اتنے میں کھانے کا وقت آ جاتا کھانا تناول فرما کر چائے نوش فرماتے تھے۔ اس کے بعد اگر کسی سے ملنے کے لیے وروالہ یا سینٹ کلیمنٹ کیمپ یا بلغار کیمپ میں جانا ہوتا تو وہاں کا قصد فرماتے اور کپڑے پہن کر تیار ہو جاتے تھے اور اگر جانے کا قصد نہ ہوتا تو آرام فرماتے اور اگر کوئی ملنے کے لیے دوسرے کیمپ میں سے آتا تو اس سے باتیں کرتے۔ اگر تیز گرمی کا زمانہ ہوتا تھا تب تو وہیں چارپائی پر اور اگر کچھ بھی سردی ہوتی تو صحن میں دھوپ میں قیلولہ فرماتے تھے۔ وہاں پر ہم سب دو تین گدّے ڈال دیتے اور اس پر کمبل اور تکیہ بچھا دیا جاتا تھا اور اگر کسی نے غفلت کی تو خود تکیہ لے جاتے اور ان گدّوں اور کمبل کو بچھا کر آرام فرماتے۔ دو تین گدّے ہم نے زائد اسی واسطے لے رکھے تھے جو کہ ہمیشہ علاحدہ رکھے رہتے تھے اور جب تک وہ حاصل نہ ہوئے تھے تو بعض چارپائیوں کے گدّے اٹھا لیے جاتے تھے۔ تقریباً دو یا ڈیڑھ گھنٹے تک اسی طرح آرام فرماتے تھے۔ پھر قضائے حاجت کے لیے تشریف لے جاتے اور پھر وضو فرمانے کے بعد تلاوتِ قرآن شریف، دلائل الخیرات، حزب الاعظم وغیرہ میں مشغول ہوتے مگر قرآن شریف بہت زیادہ پڑھتے تھے۔ غالباً روزانہ دس بارہ پارے پڑھتے تھے۔ ظہر کی اذان تک اسی حالت میں رہتے تھے پھر مسجد میں تشریف لاتے اور نماز سے فارغ ہو کر اگر وحید کا سبق ہوتا تو کبھی اس وقت میں اور کبھی صبح کو اپنے اوراد سے فارغ ہو کر کھانے کے وقت تک پڑھاتے تھے۔ بلکہ اکثر صبح ہی کو پڑھاتے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد اکثر مولانا رحمۃ اللہ علیہ ذکرِ خفی لسانی میں مشغول ہوتے تھے وہ ایک ہزار دانے والی تسبیح چادر یا رومال کے نیچے چھپا کر بیٹھ جاتے اور ذکر کرتے تھے۔ مغرب کے بعد بھی ذکرِ خفی میں مشغول ہو جاتے تھے''۔ [19]

شیخ الہندؒ: مجاہدانہ سرگرمیوں کی عدمِ قبولیت کے خوف سے گریہ:

دین کی سربلندی اور خلافت اسلامی کی بقا و استحکام کے لیے زندان و اسیری، عبادات و اذکار کی

پابندی، اور ترجمہ قرآن کی سعادت کے باوصف شیخ الہندؒ کی کیفیت یہ تھی کہ:

''جس وقت مالٹا میں تھے، ایک روز بیٹھے ہوئے رو رہے تھے، ساتھیوں نے پوچھا کیا حضرت گھبرا گئے ہیں؟ یہ لوگ سمجھے کے گھر بار یاد آ رہا ہوگا، یا جان جانے کا خوف ہوگا۔ فرمایا کہ میں اس وجہ سے نہیں رو رہا ہوں جو تم سمجھے ہو، بلکہ اس وجہ سے رو رہا ہوں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں یہ مقبول بھی ہے یا نہیں''۔ [۲۰]

حسن خلق بھی عبادت ہے:

ذوق عبادت اور بندگی کا ایک اہم، عظیم اور غالب حصہ مخلوقات سے معاملات اور تعلقات سے متعلق ہے ـــــ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الخلق عیال اللّٰہ، فأحب الناس الی اللّٰہ من أحسن الیٰ عیاله. [۲۱]

''مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ محبت اس شخص سے ہے، جو اس کے کنبے سے حسن سلوک سے پیش آئے''۔

عام طور پر یہ بات قابل مشاہدہ ہے کہ اگر کوئی بزرگ یا عالم درس و تدریس، تصنیف و افتا یا صوفیانہ امور میں مشغول رہتا ہے تو اسے بالعموم کاروبار دنیا اور لوگوں سے میل جول اور تعلق و اختلاط سے مستثنیٰ سمجھا جاتا ہے، بلکہ پیش قدمی کر کے اگر یہ بھی کہہ دیا جائے کہ فی زمانہ مؤخر الذکر غفلت اور اول الذکر انہماک ہی کو سلوک و عرفان کی معراج سمجھا جانے لگا ہے تو مبالغہ نہ ہوگا ـــــ یہ رویہ فی الحقیقت سیرت نبویؐ، اسوۂ صحابہؓ و اہل بیتؓ اور اخلاق صوفیہ تینوں کے منافی ہی نہیں بلکہ ایک ایسی غیر متوازن شخصیت کا غماز بھی ہے، جو دین کے ایک بہت اہم اور بڑے حصے سے خود کو اپنی ان انفرادی ''ذمے داریوں'' کے باعث مستثنیٰ سمجھنے لگتا ہے۔ جس کے حصول اور جس کی ادائیگی کے لیے نصوص میں متواتر ترغیب و تحریص دلائی گئی ہے:

طریقت بہ جز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

شیخ الہندؒ: ذوق عبادت اور حسن خلق کے جامع:

شیخ الہندؒ اسلاف کے طریق کی اتباع و پیروی میں عبادت و اخلاق دونوں کے توازن کا مظہر تھے ـــــ مولانا عزیز الرحمٰن بجنوری آپ کے عبادات و معاملات کے مابین توازن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''طالب علمی کی زندگی کے بعد متصلاً ہی معلمانہ زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے یہ زندگی بھی آپ کی مکمل ترین زندگی ہے۔ دن میں دس دس، گیارہ گیارہ گھنٹے درس کے بعد سلوک و تصوف کے تمام اشغال نہایت پابندی

سے ادا کرتے تھے۔ صلوٰۃ با جماعت کا تو اس قدر اہتمام تھا کہ تکبیر اولیٰ تک فوت نہ ہوتی۔ غرض کہ پورا دن اسی مشغولیت میں صرف ہوتا۔ مہمانوں کی کثرت، ان کی دیکھ بھال اور خدمت، بال بچوں کی تربیت اور اہلِ بیت کے حقوق کی ادائیگی، غرض کہ کوئی سی مشغولیت بھی آپ کو صلوٰۃ با جماعت، ادائے اوراد و وظائف اور قیام اللیل سے مانع نہ ہوتی تھی''۔[۲۲]

شیخ الہندؒ: طالبان علوم سے تعلق اور شفقت:

شیخ الہندؒ، دار العلوم دیو بند کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس تھے۔ ظاہر ہے طالبان علوم سے ان کا سابقہ واسطہ ہمہ وقتی تھا۔ شیخ الہندؒ کے احوال کا مطالعہ اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ آپ طالبان علوم کے لیے بے حد شفیق اور مہربان تھے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''[شیخ الہندؒ کو] طالب علموں سے بے حد انس تھا''۔[۲۳] آپ کا علمی رعب اور آپ کی عرفانی وجاہت آپ کے اور طلبا کے درمیان کبھی حائل نہ ہوتی۔ طلبا بے تکلف آپ سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا کرتے تھے۔ مولانا قاری محمد طیبؒ سے منقول ہے کہ ایک دن طلبا نے کہا:

> ''حضرت! تیرنا سکھلا دیجیے! چناں چہ جمعے کے دن سویرے طلبا کو ہمراہ لے کر دیو بند سے باہر تالاب پر گئے اور ہر ایک کو تیرنا سکھایا۔ ایک پنجابی طالبِ علم نے کہا حضرت! لائیے میں آپ کی کمر مل دوں۔ یہ کہہ کر اس نے کمر ملنا شروع کر دی۔ حضرت شیخ الہندؒ کا جسم بہت نرم تھا۔ طالبِ علم نے سمجھا میل بہت ہے اس لیے فوراً ہی ریت اٹھا کر ملنا شروع کیا۔ جس کی وجہ سے کھال چھل گئی، مگر حضرت نے اُف نہ کی۔ جب واپس ہوئے تو راستے میں ایک بیل کو دیکھا۔ جس کی کمر سے خون جاری تھا۔ پنجابی طالبِ علم نے کہا کسی ظالم نے اس کو کتنی بری طرح مارا ہے۔ حضرت نے فرمایا جی ہاں کسی پنجابی نے اس کی کمر ملی ہوگی''۔[۲۴]

اللہ اکبر! ایک تو طلبا پر شفقت کا یہ عالم، اس طالب علم کی غلطی اور اپنی تکلیف پر ادنیٰ گرانی کا اظہار کیے بغیر بات کو مزاح میں ٹال دینا یہی شیخ الہندؒ کا وصف تھا۔

شیخ الہندؒ: بے نفسی اور عاجزی کا عظیم مظہر:

عجب اور تکبر کے بالمقابل بے نفسی و تواضع ہے۔ اس کی حقیقت زبانی اظہار سے زیادہ عملی ہے۔ یہ خود کو محض ہیچ مداں، احقر، خاکسار اور فقیر کہہ دینے سے عبارت نہیں بلکہ اس کی حقیقت خود کو کسی بھی امتیازی وصف کی بنا پر عام لوگوں سے بلند سمجھے جانے کی عملی نفی ہے۔ بلکہ عارفین نے تو یہ بات نہایت وضاحت سے فرمائی ہے کہ جس نے اپنے لیے تواضع کو ثابت کیا وہ بے شبہہ متکبر ہے، کیوں کہ تواضع کا دعویٰ تو اپنی رفعت قدر کے مشاہدے کے بعد ہوگا، پھر جب اپنے لیے تواضع کا دعویٰ کیا گیا تو گویا اپنے مرتبے کی بلندی کا مشاہدہ کیا، یہی تکبر ہے۔ بے نفس، متواضع اور عجب سے پاک شخص ہمیشہ عام انسانوں میں گھلا ملا رہتا ہے۔

اس کے انداز و اطوار حاکمانہ نہیں ہوتے اور نہ وہ خوردوں سے کسی بڑائی یا تعظیم کا متمنی ہوتا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ اس وصف میں بھی نمایاں اور ممتاز تھے، حضرت مدنی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''حضرت شیخ الہندؒ کا طبعی مذاق تھا کہ وہ غرباء اور معمولی آدمیوں میں رہنا پسند فرماتے تھے اور اپنی عادت، لباس، چال، معاملات وغیرہ اس قسم کا رکھنا چاہتے تھے۔ اہل دنیا اور امرا اور تکلف والوں سے گھبراتے تھے ...... ریل میں تیسرے درجے میں سفر کرنا پسند فرماتے تھے''۔ [۲۵]

وہ بداہتہً خود کو ہر کمال اور عظمت سے معرا باور کرتے تھے۔ مولانا قاری محمد طیبؒ لکھتے ہیں:

''اس رفعت شان پر بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ گویا نفس کا کوئی تقاضا باقی ہی نہیں رہا تھا۔ یا اس کے پورے ہونے کی کوئی صورت نہیں رہ گئی تھی، یا اسے پامال کرنے کی فکر ہر وقت دامن گیر رہتی تھی''۔ [۲۶]

اس سلسلے میں شیخ الہندؒ کی زندگی کے تین واقعات ملاحظہ کیجیے۔ یہ عاجزی و فروتنی آج بھی عوام سے زیادہ خواص سے اتباع و تقلید کا مطالبہ کر رہی ہے۔ قاری محمد طیبؒ لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں اکثر مساجد میں کسیر بچھا دی جاتی تھی جو نرم بھی ہوتی تھی اور گرم بھی، یہ گھاس تالابوں میں پیدا ہوتی ہے، جب سوکھ جاتی ہے تو لوگ اسے بچھانے کے لیے لے آتے تھے، اسے دیہات کا قالین یا نرم گدہ سمجھنا چاہیے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی مسجد میں بھی سردیوں میں برابر اس کا فرش ہوتا تھا، موسم سرما آنے پر ایک دن خود ہی طلبہ سے فرمایا کہ آؤ بھئی مسجد کے لیے کسیر لے آویں، چار طلبا کے ساتھ ہو لیے، انھیں حضرت اپنے باغ میں لے گئے، وسطِ باغ میں تالاب بھی تھا اور اس پر کسیر بہ کثرت پیدا ہوتی تھی، چناں چہ کسیر کاٹی گئی، خود حضرت بھی درانتی سے کاٹنے میں شریک رہے، کاٹ کر جمع شدہ ذخیرے کے پانچ گٹھر بنائے، طلبا نے عرض کیا کہ حضرت پانچ گٹھریاں کیوں بنائی گئی ہیں ہم تو چار ہیں، فرمایا اور میرا حصہ کہاں گیا؟ یہ کہہ کر چار بڑی بڑی گٹھریاں تو طلبا کے سروں پر رکھوائیں اور ایک اپنے سر پر رکھی، ہر چند طلبا بہ ضد ہوئے کہ حضرت اس ذخیرے کی چار گٹھریاں کر دی جائیں ہم کافی ہیں، کچھ زیادہ بوجھ نہیں، مگر حضرت نے نہ مانا، چار گٹھریاں طلبا کے سروں پر اور ایک اپنے سر پر رکھ کر یہ قافلہ چلا۔ شہر میں آیا اور بازار کے ایک حصے میں سے گذرا، ان طلبا کو تو ممکن ہے کہ سر پر گھاس رکھ کر بازار میں سے گذرنے پر کچھ عار آرہا ہو لیکن حضرت کی بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ گویا اپنے کو اس بوجھ اٹھانے کا اہل اور مستحق سمجھ کر شہر سے گذر رہے تھے، دیہات والے بھی اب جسے پسند نہیں کرتے موصوف کے یہاں وہ بوجھ ایک معمولی بات تھی''۔ [۲۷]

قاری محمد طیبؒ اسی واقعے سے متصل ایک اور واقعہ بھی نقل کرتے ہیں جس میں تواضع، خاکساری، للّٰہیت، شفقت، محبت اور حسن ادا سب ہی اسباق موجود ہیں، قاری صاحب لکھتے ہیں:

''میرے خسر مولوی محمود صاحب رام پوری فرماتے تھے کہ وہ دیوبند میں طالب علمی کے زمانے میں چھوٹی مسجد میں رہا کرتے تھے، جس میں حضرت مفتیٔ اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کا قیام تھا، اس

زمانے میں طلبا میں چارپائی کا دستور نہ تھا، سادگی اور تواضع سے عموماً طلبہ زمین پر لیٹتے تھے۔ مولوی صاحب باوجود رئیس گھرانے کا ایک فرد ہونے کے عام طلبا کی طرح فرش زمین پر ہی اپنے حجرے میں لیٹا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کا موصوف سے اور رام پور کے اس گھرانے سے بہت گہرا اور مخلصانہ تعلق تھا اور مولوی محمود صاحب مرحوم سے یوں بھی خصوصیت زیادہ تھی، ایک دن حضرت شیخ الہندؒ چھوٹی مسجد میں تشریف لائے اور مولوی محمود صاحب کے حجرے پر گذر ہوا، یہ زمین پر فرش بچھائے لیٹے تھے، فرمایا محمود! تیرے پاس چارپائی نہیں؟ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت چارپائی تو نہیں ہے، مجھے زمین پر لیٹنے کی عادت ہوگئی ہے، اس سے بہت متاثر ہوئے مگر فرمایا کچھ نہیں، اگلے دن دوپہر کا وقت تھا گرمی شدید تھی، لو چل رہی تھی کہ مولوی صاحب نے کھڑکی سے دیکھا، حضرت اپنے کندھے پر ایک چارپائی لیے خود تشریف لا رہے ہیں، وزنی چارپائی ہے مگر اسے سر پر اٹھا رکھا ہے۔ مولوی صاحب صورت حال دیکھتے ہی حجرے سے نکل ننگے سر اور ننگے پیر حضرت کی طرف دوڑے، حضرت انھیں بھاگتا ہوا دیکھ کر وہیں سڑک پر کھڑے ہوگئے اور چارپائی زمین پر رکھ دی، جب قریب پہنچے تو ایک خاص انداز سے فرمایا جناب یہ لے جاؤ اپنی چارپائی مجھ سے نہیں اٹھتی، میں بھی شیخ زادہ ہوں مجھ سے یہ چارپائیاں نہیں گھسیٹی جاتیں۔ یہ فرما کر پیٹھ پھیر لی اور گھر روانہ ہوگئے، مولوی صاحب کچھ کہنے ہی نہ پائے اور چارپائی اٹھا کر حجرے میں لے آئے، گویا انھیں کوئی کلمۂ معذرت بھی نہیں کہنے دیا کہ وہ معنی ثناءِ حسن ہوجاتی''۔[۲۸]

شیخ الہندؒ: بہ یک وقت اپنے معمول کی پابندی اور طلبا کی رعایت:

حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ ہی نقل کرتے ہیں کہ:

''حضرت نانوتوی کی وفات کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کی عادت تھی کہ ہر جمعرات کو حضرت گنگوہیؒ کے پاس حاضری کے لیے گنگوہ کا سفر پیدل کرتے تھے، جمعرات کو چھٹی کا گھنٹہ بجتا، اسی وقت سبق سے اٹھ کر گنگوہ کا راستہ لیتے، گنگوہ دیوبند سے ۲۲ کوس یعنی ۳۰ میل ہے، حضرت اذان عصر پر چلتے اور عشا گنگوہ پڑھ لیتے تھے۔ جمعے کا پورا دن حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں گزار کر اذان عصر کے قریب گنگوہ سے واپس ہوتے اور عشا دیوبند میں پڑھ لیتے تھے۔ برس ہا برس یہ معمول رہا، سردی ہو یا گرمی یہ معمول قضا نہ ہوتا تھا۔

مولوی محمود صاحب کا بیان ہے کہ ایک دن ہم دو تین طلبا نے اصرار کیا کہ حضرت ہم بھی ساتھ چلیں گے، فرمایا اچھا، مگر اس دن حضرت نے ان طلبا کی رعایت سے پیدل سفر کرنے کے بجائے ارادہ کیا کہ سفر سواری پر ہو، تو کمہار کا ایک ٹٹو کرایہ پر لے لیا اور ارادہ یہ کیا کہ دو تین طلبا اترتے چڑھتے چلے جائیں گے، چناں چہ کمہار ٹٹو لے کر دار العلوم کے دروازے پر آ گیا، حضرت حسبِ معمول اذانِ عصر کے قریب درس سے اٹھے، یہ طلبا بھی حاضر تھے تو حضرت نے فرمایا کہ بھائی میاں محمود پہلے تم سوار ہو پھر باری باری ہم بھی سوار

ہوتے رہیں گے، انھوں نے حضرت کے سوار ہونے پر اصرار کیا تو حضرت نے نہ مانا اور زبردستی مولوی محمود صاحب کو سوار کر دیا، دو طلبا اور خود حضرت پیچھے پیچھے پیدل روانہ ہوئے بلکہ ایک قمچی لے کر ٹٹو کو ہنکانا بھی اپنے ذمے لے لیا۔

مولوی محمود صاحب فرماتے تھے کہ میں سخت ضیق میں تھا کہ حضرت تو پیچھے پیچھے پیدل ہیں اور میں سوار ہوں مگر مجبور تھا حکم یہی تھا، دو چار میل چل کر یہ ٹٹو سے اتر گئے تو حضرت نے زبردستی دوسرے طالب علم کو بٹھا دیا اور خود ٹٹو ہانکتے جا رہے ہیں، چار پانچ میل کے بعد دوسرے طالب علم کو چڑھا دیا۔ غرض تیس میل کا سفر پورا طے ہو گیا مگر خود نہیں چڑھے باری باری ان طلبا کو بٹھاتے رہے، اس وقت معلوم ہوا کہ یہ ٹٹو اپنے لیے کرائے پر نہیں لیا تھا بلکہ ان طلبہ کے لیے شفقتاً لیا گیا تھا۔ جمعے کو واپسی ہوئی تو طلبہ گھبرائے کہ اب پھر وہی معاملہ ہوگا کہ ہم ٹٹو پر سوار ہوں گے اور حضرت پیدل چلیں گے، باہم مشورہ ہوا کہ آخر کیا صورت اختیار کی جائے کہ ہم پیدل چلیں اور حضرت کو ٹٹو پر سوار کر دیں۔

مولوی محمود صاحب فرماتے تھے کہ میں نے کہا ترکیب تو میں کر دوں گا کہ حضرت پورے راستے ٹٹو سے نہ اتر سکیں مگر ایک دفعہ سوار کر دینا ہے۔ چناں چہ جب گنگوہ سے روانگی ہوئی تو حسبِ معمول طلبا پر زور دیا کہ سوار ہو مگر یہ لوگ ایکا کر چکے تھے عرض کیا کہ حضرت آتے ہوئے ہم سوار رہے اب واپسی میں یہ نہیں ہوگا، حضرت سوار ہوں خواہ پھر اتر لیں مگر ابتدا حضرت ہی کے سوار ہونے سے ہوگی۔

جب یہ سب اکٹھے ہو کر بہ ضد ہوئے تو آخر حضرت نے قبول فرما لیا اور ٹٹو پر سوار ہو گئے۔ طلبا نے چپکے سے مولوی محمود سے کہا کہ تم اب وہ موعودہ ترکیب کرو کہ حضرت دیوبند تک ٹٹو سے نہ اترنے پائیں، چناں چہ مولوی صاحب نے وہ مؤثر نسخہ استعمال کیا کہ جب حضرت سوار ہو گئے تو انھوں نے ٹٹو کے برابر میں آ کر حضرت نانوتویؒ، حضرت حاجی امداد اللہؒ، حضرت حافظ شہیدؒ وغیرہ اکابر کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ حضرت کی عادت تھی کہ ان بزرگوں کا ذکر چھڑتے ہی ان میں محو ہو جاتے تھے اور پھر ادھر اُدھر کی کچھ خبر نہیں رہتی تھی۔

ان حضرات کا ذکر چھڑتے ہی جو حضرت نے ان بزرگوں کے واقعات بیان کرنے شروع کیے تو حضرت کو نہ راستے کی خبر رہی نہ ان طلبا کی، پورے تیس میل کا سفر طے ہو گیا، ندی آ گئی جو دیوبند سے تین چار میل کے فاصلے پر ہے۔ ندی دیکھتے ہی حضرت نے گھبرا کر فرمایا کہ او ہو! ندی آ گئی اور یہ کہہ کر ٹٹو سے کود کر اترے۔ فرمایا بھائی میں نے تم سب کا حق مار لیا لو جلدی سے تم سوار ہو، طلبہ نے ہر چند حضرت کے بیٹھنے کا اصرار کیا مگر حضرت تہیہ فرما چکے تھے کسی کی نہیں سنی، باری باری ان لوگوں کو بٹھلایا، شہر میں داخل ہوئے تو پھر اسی شان سے کہ طلبا سوار ہیں اور حضرت پیدل ہیں، قمچی ہاتھ میں ہے اور ٹٹو ہانک رہے ہیں جس سے طلبا بچنا چاہتے تھے بالآخر وہی چیز پھر سامنے آ کر رہی۔ سبحان اللہ بے نفسی اور شفقت کی انتہا ہے۔[۲۹]

شیخ الہندؒ: اتباع شیخ کا مثالی نمونہ:

اس مقام پر اگر چہ یہ واقعہ شیخ الہندؒ کے معمول کی پابندی اور طلبا کے حق میں شفقت و رعایت کی غرض سے بیان کیا گیا ہے، لیکن اگر اس سے متصل ایک اور اہم واقعہ بیان نہ کیا جائے تو بات ادھوری رہ جائے گی اور منازل سلوک واحسان میں شیخ کی اتباع کامل کے متعلق شیخ الہندؒ کا اسوہ پوری طرح نکھر کر سامنے نہیں آسکے گا۔ شیخ الہندؒ کا یہ معمول ذکر کیا جا چکا ہے کہ آپ کا جمعرات کے روز چھ گھنٹے پڑھانے کے بعد دیوبند سے گنگوہ پیدل جانے کا معمول تھا۔ ایک دفعہ:

''شیخ الہندؒ کے دوست نے جو زمانہ طالب علمی سے دوست تھے اور بعد میں سرکاری ملازمت اختیار کر لی تھی، پوچھا کہ او محمود! بتا تو دے، گنگوہ میں کیا رکھا ہے جو تو ہر جمعرات کو دوڑا دوڑا جاتا ہے؟ شیخ الہندؒ نے جواب دیا: ظالم تو نے پی ہی نہیں! اب کے تو بھی چل! ——— وہ ساتھ جانے پر تیار ہو گیا، چناں چہ ساتھ لے گئے، اتفاق سے ان دنوں شاہ عبد القدوس گنگوہیؒ کے مزار پر عرس ہو رہا تھا۔ حضرت امام ربانی [گنگوہیؒ] کا معمول عرس کے ایام میں ابتداً تو یہ تھا کہ ان دنوں میں گنگوہ چھوڑ دیتے تھے، خانقاہ خالی کر دیا کرتے تھے اور جب معذور ہو گئے تھے تو سفر ترک فرما دیا تھا۔ ہاں! خانقاہ میں نہیں آتے تھے، البتہ نماز کے لیے پانچوں وقت تشریف لاتے، بلکہ نماز خود ہی پڑھایا کرتے تھے۔ اتنا لحاظ عرس والے بھی کرتے تھے کہ اذان کے وقت سے جماعت ختم ہو جانے اور سنتیں وغیرہ پڑھنے تک قوالی بند کر دیا کرتے تھے۔ ان ایام میں حضرت کے یہاں مہمانوں کی آمد و رفت بالکل بند رہتی تھی، کسی سے مصافحہ تک نہیں کرتے تھے ——— غرض حضرت شیخ الہندؒ رات کے وقت گنگوہ پہنچے اور حضرت کے مکان پر حاضر ہوئے۔ حضرت نے دیکھتے ہی ڈانٹنا شروع کر دیا اور فرمایا، ابھی واپس جاؤ۔ آپ [شیخ الہندؒ] کے ایک اور بھائی اور دوست تھے شاہ مظہر حسین گنگوہیؒ، مولانا فخر الحسن گنگوہی محشی ابو داؤد کے بھائی، انھوں نے عرض کیا، حضرت! یہ عرس میں شرکت کے لیے نہیں آئے، آپ کے پاس آئے ہیں۔ حضرت [گنگوہیؒ] نے ارشاد فرمایا، میں بھی جانتا ہوں عرس میں شرکت کے لیے نہیں آئے، میں اتنا بھولا نہیں ہوں۔ میرے پاس آئے ہیں، مگر آئے تو ہیں اس مجمعے میں ہو کر، ان کے ذریعے اس مجمعے کی رونق تو بڑھی، **من کثر سواد قوم فھو منھم** [جس نے کسی قوم کے افراد میں اضافہ کیا وہ ان ہی میں سے ہے] وارد ہوا ہے، قیامت کو اپنی برأت کرتے رہیں۔ اس کے بعد شاہ مظہر حسن گنگوہیؒ ان [شیخ الہندؒ] کو اپنے مکان پر لے گئے اور کہا روٹی تو کھا لو، اس پر حضرت شیخ الہندؒ نے آب دیدہ ہو کر فرمایا کہ ''حضرت تو فرماویں ابھی چلا جا، میں کس منہ سے کھاؤں!'' چناں چہ اسی وقت گنگوہ سے واپس ہو گئے پھر دوسرے وقت عرس ختم ہونے کے بعد حاضر ہوئے''۔ [۳۰]

شیخ الہندؒ: استاذ نانوتوی کی خدمت: ۲۲؍میل کا پیدل سفر:

جس انسان کا نفس اس درجے مزکی اور مطہر ہو چکا ہو، اس کا قلب اپنے محسنین اور اساتذہ، جن سے اسے علم وفضل اور صلاح وتقوے بلکہ ایمان میں رسوخ اور عمل میں دوام کی دولت میسر آئی ہو، کی محبت سے کس درجے لبریز ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ یہ محبت ہی انسان کو محبوب کا خادم اور محبوب کو مخدوم بناتی ہے۔ اس خدمت کا صرف ایک نمونہ دیکھیے، ایک مرتبہ مولانا نانوتویؒ کو بخار تھا۔ زمانہ برسات کا تھا اور آنا دیوبند تھا۔ شیخ الہندؒ نے استاذ نانوتویؒ کو گھوڑے پر سوار کیا، ایک ہاتھ سے اس کی لگام پکڑی اور ایک ہاتھ سے رکاب کے قریب ہو کر حضرت کی کمر کو سہارا دیا اور اس طرح ۲۲؍میل کا راستہ پیدل طے کیا۔[۳۱]

۲۲؍میل کا پیدل سفر —— یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو استاذ کی محبت نے بے خود کر دیا ہو۔

شیخ الہندؒ: مولانا نانوتویؒ کے والد کی اولاد سے بڑھ کر خدمت:

چلیے حضرت نانوتویؒ تو استاذ تھے، اس طرز کی خدمت کی مثالیں ڈھونڈنے سے دیگر باصفا حضرات کے یہاں بھی مل جائیں گی۔ لیکن ایک واقعہ اس سے زیادہ حیران کر دینے والا ہے جو استاذ نانوتویؒ سے نہیں بلکہ ان کے والد محترم سے متعلق ہے۔ مولانا قاری طیبؒ لکھتے ہیں:

> ''حضرت نانوتوی کے والد شیخ اسد علی مرحوم جب مرض وفات میں شدید مبتلا ہوئے تو علاج کے لیے دیوبند لائے گئے، قیام شیخ الہند کے مکان پر ہوا، دستوں کا مرض تھا......ایک دفعہ دست چارپائی پر خطا ہو گیا اس وقت حضرت نانوتوی بھی یہاں موجود نہ تھے، حضرت شیخ الہند موجود تھے اور صورت ایسی ہوگئی کہ نجاست اٹھانے کے لیے ظرف بھی نہ تھا۔ حضرت شیخ الہند نے بے تکلف ساری نجاست اپنے ہاتھوں اور ہتھیلیوں میں لے لی اور سمیٹنی شروع کر دی، تمام ہاتھ گندگی میں آلودہ ہی نہ تھے بلکہ ہاتھوں میں نجاست لبریزی کے ساتھ بھری ہوئی تھی۔ حضرت نانوتوی پہنچ گئے اور دیکھا کہ حضرت شیخ الہند کے دونوں ہاتھ نجاست اور مواد سے بھرپور ہیں اور وہ اسے سمیٹ سمیٹ کر بار بار باہر جاتے ہیں اور پھینک پھینک کر آتے ہیں۔ اس پر حضرت نانوتوی بہت متاثر ہوئے اور وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اور عرض کیا کہ خداوند! محمود کے ہاتھوں کی لاج رکھ لے اور اس خاص وقت میں جو جو بھی اپنے اس محبوب تلمیذ کے لیے مانگ سکتے تھے ہاتھ اٹھائے ہوئے مانگتے رہے''۔[۳۲]

مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ کی اولادوں سے خادمانہ برتاؤ کے مظاہر:

اس خدمت ومحبت اور مولانا نانوتویؒ کے دل سے نکلی ہوئی دعاؤں نے شیخ الہندؒ کی عظمت ورفعت کو

ثریا تک پہنچادیا —— مولانا نانوتویؒ کے خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے ذہین وذکی تلامذہ ہوں گے، لیکن آج ان کی اکثریت کا نام تاریخ اور ماضی کے دھندلکوں کی نظر ہو چکا اور شیخ الہندؒ کا نام مولانا نانوتویؒ کے ساتھ ایسے جڑا ہوا ہے جیسے رومیؒ کا شمس تبریز کے ساتھ —— یہ استاذ کی محبت ہی کا اثر ہے کہ مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ کے متعلقین سے شیخ الہندؒ خادمانہ برتاؤ فرماتے تھے اوران کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے —— مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے صاحبزادے حافظ محمد احمد صاحبؒ، جو شیخ الہند کے شاگرد تھے، کے متعلق شیخ الہندؒ نے فرمایا:

''حافظ احمد کا میرے دل میں اتنا احترام ہے کہ اگر وہ پاخانے کی ٹوکری اٹھانے کو بھی مجھ سے کہیں تو میں اس کی تعمیل کو اپنی عزت سمجھوں گا''۔[۳۳]

شیخ الہندؒ، حافظ صاحب کے استاذ ہوتے ہوئے بھی ان کے سامنے مؤدب اور نیاز مندانہ بیٹھا کرتے تھے۔ یہ معمول کی بات تھی کہ جب حافظ صاحب شیخ الہندؒ کے مکان پر تشریف لے جاتے اور شیخ الہند صحن مکان میں چارپائی پر بیٹھے ہوتے، دروازے کے سامنے کی سڑک کی لمبی مسافت سے جہاں حافظ صاحب آتے ہوئے شیخ الہند کو نظر پڑ جاتے تو حضرت چارپائی چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے اوراس وقت تک کھڑے رہتے تھے جب تک کہ حافظ مکان میں پہنچ کر اپنی جگہ بیٹھ نہ جائیں اوران کے بٹھانے کی صورت یہ ہوتی تھی کہ حضرت شیخ کرسی منگواتے، اسے اپنے سرہانے بچھاتے، جب حضرت حافظ صاحب اس پر بیٹھ جاتے تب حضرت چارپائی پر بیٹھ جاتے۔[۳۴]

یہ تو بہ راہِ راست مولانا نانوتوی کی اولاد کا معاملہ تھا، اب مولانا نانوتویؒ کی تیسری نسل یعنی حافظ محمد احمدؒ کے صاحبزادگان مولانا قاری محمد طیب اور مولانا محمد طاہر کے ساتھ رویہ دیکھیے۔ قاری محمد طیبؒ لکھتے ہیں، جب شیخ الہندؒ نے مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند ورود فرمایا تو حافظ صاحب نے فرمایا کہ حضرت ان دونوں بچوں [محمد طیب اور محمد طاہر] کو بیعت فرمالیجیے تو ازراہ تفنن فرمایا:

''لوگ مجھے کہتے ہیں کہ یہ بڑا ہوشیار ہے۔ دو بزرگوں [حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ] کے دو ہی صاحبزادے ہیں [مولانا مسعود احمد گنگوہیؒ اور حافظ احمد صاحبؒ] اس نے دونوں پر پہلے ہی سے قبضہ جما رکھا ہے، اب اگر ان بچوں کو بھی بیعت کرلیا تو کہیں گے کہ دیکھو اس نے آگے کو بھی قبضہ رکھنے کو داغ بیل ڈال دی ہے —— دو دن کے بعد اچانک خود ہی دارالعلوم تشریف لا کر مجھے اور طاہر مرحوم کو بلایا، ہمارے ذہن میں بھی نہیں رہا تھا کہ ہمیں بیعت بھی ہونا ہے۔ میں نے عرض کیا حضرت کیوں یاد فرمایا؟ فرمایا مرید کرنا ہے۔ اس وقت ندامت سی ہوئی کہ اس کے لیے ہمیں خود حاضر ہونا تھا، لیکن یہاں قصہ برعکس ہو رہا ہے''۔[۳۵]

استاذ کی اولاد کی اولاد کے حق اور خدمت کا ایک اور محیر العقول واقعہ دیکھیے جو اپنے تاثر میں اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ جب قاری طیب صاحبؒ کا رشتہ شیخ الہند کے ایما وحکم پر رام پور کے ایک باعزت ودین دار گھرانے میں طے ہوا تو شیخ الہندؒ نے بڑی امنگ اور جوش مسرت سے فرمایا کہ بھائی! یہ رشتہ میں لے کر جاؤں گا۔ چناں چہ یہ پیغام خود ہی لے کر رام پور تشریف لے گئے اور وہاں جا کر فرمایا:

''میں اس وقت حضرت نانوتویؒ کے گھرانے کے ایک ڈوم اور حجام کی حیثیت سے رشتے کا پیامی بن کر آیا ہوں''۔ [۳۶]

شیخ الہندؒ: بہ صد گریہ مولانا نانوتویؒ کی اہلیہ کے جوتے سر پر رکھنا:

پے بہ پے خدمت، عظمت وتعلق اور اس خادمانہ پاس ولحاظ کے باوصف شیخ الہندؒ ہمیشہ اس بات پر نادم اور شرمندہ رہے کہ انھوں نے مولانا نانوتویؒ کے احسانات کا حق ادا نہیں فرمایا۔ چناں چہ سفر حجاز کے لیے روانہ ہوتے وقت مولانا نانوتوی کے گھر حاضر ہوئے، مولانا نانوتوی کی اہلیہ کی خدمت میں عرض کیا:

''اماں جی! آپ کی کوئی خدمت نہیں کی، بہت شرمندہ ہوں، اب سفر میں جا رہا ہوں، ذرا اپنا جوتہ دے دیجیے، انھوں نے پس پردہ سے جوتا آگے بڑھا دیا، حضرت شیخ الہندؒ نے اس کو لے کر اپنے سر پر رکھا اور روتے رہے کہ میری کوتاہیوں کو معاف فرما دیجیے''۔ [۳۷]

مولانا نانوتویؒ ومولانا گنگوہیؒ کے صاحبزادگان سے اصرار: کہہ دو! یہ ناکارہ ہمارا خادم ہی رہا:

چلیے یہ تو حضرت نانوتوی کی اہلیہ تھیں، شیخ الہندؒ کے لیے ماں کے مثل تھیں، ان کے روبہ رو یہ عاجزی اور ندامت قابل فہم بھی ہے لیکن مولانا نانوتویؒ کے صاحبزادے حافظ محمد احمد صاحبؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے صاحبزادے مولانا حکیم مسعود کے بالمقابل بھی شیخ الہندؒ کی عاجزی اور ندامت کا یہی عالم تھا۔ جب کہ حافظ صاحب شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے اور حکیم صاحب مرید ـــــ حضرت مدنی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ:

''حضرت شیخ الہند کے مالٹا سے آنے کے بعد حضرت کی مردانہ نشست کے سامنے کے کمرے میں بند کواڑ کھول کر میں اچانک اندر گھسا تو یہ منظر دیکھا کہ دونوں مخدوم زادے ابن قاسم حضرت حافظ اور ابن رشید حضرت حکیم مسعود احمد صاحب گنگوہی تخت پر ہیں اور حضرت شیخ الہند تخت سے نیچے ان دونوں کے سامنے مؤدب بیٹھے ہیں اور رو رہے ہیں اور ہاتھ جوڑے ہوئے انتہائی نیازمندی سے کہہ رہے ہیں کہ میں نے آپ دونوں کا کوئی حق واجب ادا نہیں کیا، اب میرے مرنے کا وقت ہے اور دونوں بزرگوں [حضرت قاسم اور حضرت گنگوہی] کو منہ دکھانا ہے تو میں انھیں ان کے صاحبزادوں کے بارے میں کیا جواب دوں گا، تم دونوں کوئی کلمہ تسلی کا میرے لیے کہہ دو کہ میں وہی کلمہ ان بزرگوں کے سامنے کہہ دوں اور قیامت کے دن یہ

بزرگ خود تم سے کچھ پوچھیں تو تم بھی کلمۂ خیر کہنا کہ یہ ناکارہ خادم ہمارا خادم ہی رہا اور ہم سے الگ نہیں ہوا''۔ [۳۸]

یہی وہ اوصاف تھے جس نے شیخ الہندؒ کو جاودانی بخشی تھی۔ اپنے شاگرد اور مرید کے روبہ رو ہاتھ جوڑ کر وہی شخص بیٹھ سکتا ہے جو مقام احسانی کو پا چکا ہو۔ یہ بے نفسی اور فنائیت عظیم مجاہدات اور سینکڑوں کرامات سے بلند اور بیش قیمت ہے۔

شیخ الہندؒ: جانور سے انس:

عشق و محبت کے خمیر سے پروان چڑھنے والے ہی معرفت اور احسان کے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ ایسے شخص کے دل میں انسان تو انسان جانور تک کے لیے جذبہ ترحم بیدار رہتا ہے۔ مولانا عزیز الرحمٰنؒ بجنوری لکھتے ہیں:

> ''حضرت شیخ الہندؒ کی عادت شریفہ تھی کہ ہر سال قربانی کے لیے بچھڑا خریدا کرتے تھے۔ سال بھر تک اس کی خوب خاطر کرتے اور اپنی اولاد کی طرح رکھتے تھے۔ ایک دفعہ جو بچھڑا خریدا وہ آپ سے بہت زیادہ مانوس ہوگیا۔ حضرت جب دار الحدیث درس دینے کے لیے تشریف لے جاتے تو وہ بچھڑا بھی ہمراہ جاتا اور دارالحدیث کے باہر بیٹھ جاتا۔ جب آپ سبق سے واپس ہوتے تو بچھڑا بھی آپ کے پیچھے پیچھے واپس ہوتا۔ لیکن جب قربانی کا دن آیا تو حضرت شیخ الہندؒ نے تعمیل حکم خداوندی میں خود اپنے دست مبارک سے اس کو ذبح کیا۔ راوی کا بیان ہے کہ اس وقت حضرت کی یہ حالت تھی کہ ہاتھ سے چھری چلا رہے تھے اور آنکھوں سے اشک ریزاں تھے''۔ [۳۹]

اور یہ صرف ایک دفعہ ہی کا واقعہ نہیں ہے، بلکہ مولانا محمود حسن گنگوہیؒ کی تصریح کے مطابق یہ شیخ الہندؒ کا معمول تھا کہ وہ جانور خود پالتے، اسے خود چارہ کھلاتے۔ ایام قربانی جب قریب ہو جاتے تو گھاس میں کمی کر دیتے اور بالٹی بھر کر دودھ جلیبی کھلاتے، پھر قربانی سے پہلے اس کے جگہ جگہ مہندی لگاتے اور پھر یوم نحر [۱۰ ذی الحجہ] کو قربان کر کے **لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ** پر عمل کرتے''۔ [۴۰]

وعظ اللہ کے لیے نہ کہ اظہار علم کی غرض سے: شیخ الہندؒ:

حضرت تھانوی رحمہ اللہ جس زمانے میں جامع العلوم کان پور میں مدرس تھے، وہاں جلسہ دستار بندی میں شرکت کی درخواست کے لیے اپنے اساتذہ حضرت شیخ الہند محمود حسنؒ اور مفتی عزیز الرحمٰن وغیرہ کو دیوبند خط لکھا۔ شیخ الہندؒ کی سادگی کا حال یہ تھا کہ آپ کے پاس صرف ایک کرتا، ایک پاجامہ، ایک ٹوپی اور ایک لنگی تھی۔ آپ کے کپڑے کھدر کے ہوتے، ہاتھ سے دھوئے جاتے اور انھیں استعمال کیا جاتا۔ چوں کہ کان پور میں دیگر مکتب خیال کے علما اور اہل علم سے ملاقات و نشست کا احتمال تھا، اس لیے مولانا تھانویؒ نے

شیخ الہندؒ کو خاص طور پر لکھا:

''حضرت میں ایک بات عرض کرتا ہوں، ہے تو حماقت جو میں عرض کرتا ہوں، مگر بڑے چھوٹوں کی بے وقوفی کو بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ حضرت! آپ ذرا دھلے ہوئے کپڑے پہن کر تشریف لاویں ...... حضرت شیخ الہندؒ نے جواب دیا تمھارے خط کی رعایت کی جائے گی''۔

حضرت تھانویؒ نے سب لوگوں کو خوش خبری سنائی کہ میرے استاذ شیخ الہندؒ دیوبند سے تشریف لانے والے ہیں، جو اتنے اتنے کمالات کے جامع ہیں۔ جب ان حضرات کی آمد کی اطلاع پہنچی، تو حضرت تھانویؒ ان کو لینے کے لیے اسٹیشن گئے، شیخ الہندؒ نے اپنے ہاتھ کے دھلے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھے، ایک لنگی کندھے پر تھی ـــــــ اور جو کان پور کے علما تھے وہ بڑے بڑے جبے پہنے ہوئے تھے، یہاں ان کو کوئی صورت سے بھی نہیں پہنچانتا تھا کہ یہ کوئی چار حرف بھی جانتے ہوں گے ـــــــ مولانا تھانویؒ نے وعظ وتقریر کی درخواست کی، شیخ الہندؒ نے فرمایا:

''میں اور وعظ! کیا تمھاری بدھ نہیں ہوگی کہ ایسے کے شاگرد ہیں، جن کو بولنا بھی نہیں آتا، تمھارا وعظ تو، ماشاءاللہ، وعظ ہوتا ہے''۔

حضرت تھانویؒ نے عرض کیا نہیں! نہیں! آپ وعظ فرمائیں، فرمایا:

''اچھی بات ہے، وعظ کہوں گا تاکہ سامعین کو معلوم ہو جائے کہ شاگرد استاذ سے بڑھا ہوا ہے''۔[۴۱]

وعظ شروع فرمایا، جس میں فقہ کے مسائل خوب بیان فرمائے۔ علمائے کان پور یہ سمجھتے تھے کہ دیوبند اور سہارن پور کے علماء معقولات نہیں جانتے، فقہ خوب جانتے ہیں۔ اسی اثنا میں مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھیؒ تشریف لے آئے ـــــــ شیخ الہندؒ نفس کشی کے موقعے کی تلاش میں رہتے تھے۔ جہاں کوئی ایسا موقع آیا جس سے نفس کو حظ اٹھانے کا موقع ملے یا کوئی ایسی بات ہو جس سے اپنی بڑائی یا عظمت جھلکتی ہو شیخ الہندؒ اس وقت نفس کشی کا سامان مہیا کر لیتے تھے۔ ان کی ذات وقتی تأثرات وجذبات سے بالکل غیر متاثر اور لاتعلق ہو چکی تھی۔ مولانا لطف اللہؒ کی آمد اور شیخ الہندؒ کی للّٰہیت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے مولانا تھانویؒ لکھتے ہیں:

''جناب مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھیؒ بھی کان پور تشریف لائے ہوئے تھے۔ میرے عرض کرنے پر جلسے میں تشریف لائے اور عین اثنائے وعظ میں تشریف لائے۔ اس وقت ایک بڑا عالی مضمون بیان ہو رہا تھا جس میں معقول کا ایک خاص رنگ تھا۔ ہم لوگ خوش ہوئے کہ ہمارے اکابر کی نسبت معقولات میں مہارت کم ہونے کا شبہہ آج جاتا رہے گا اور سب دیکھ لیں گے کہ معقول کس کو کہتے ہیں۔ مولاناؒ کی جوں ہی مولانا علی گڑھیؒ پر نظر پڑی فوراً وعظ بیچ ہی میں سے قطع کر کے بیٹھ گئے۔ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ بہ وجہ

ہم درس ہونے کے بے تکلف تھے، انھوں نے دوسرے وقت عرض کیا کہ یہ کیا کیا؟ یہی تو وقت تھا بیان کا۔ فرمایا ہاں! یہی خیال مجھ کو آیا تھا، اس لیے قطع کر دیا کہ یہ تو اظہارِ علم کے لیے بیان ہوا نہ کہ اللہ کے واسطے''۔[۴۲]

شیخ الہندؒ: ترجمہ قرآن کی اشاعت کے لیے تلامذہ کی تصدیق: بے مثل عاجزی:

مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ تو پھر معاصر، ذی علم اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔ان کے روبہ رو تواضع کا اختیار کرنا اتنا حیران کن نہیں جتنا اپنے تلامذہ کے سامنے تواضع کا واقعتی اظہار موجب حیرت معلوم ہوتا ہے۔حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے منقول ہے:

''جب حضرت نے قرآن پاک کا ترجمہ پورا کیا،تو حضرت نے دیوبند میں سب علما کو جمع کر کے، جو حضرت کے خدام اور تلامذہ تھے، یہ فرمایا کہ بھائی میں نے قرآن شریف کا ترجمہ پورا تو کر دیا ہے،لیکن سب مل کر اس کو دیکھ لو اگر پسند ہو تو شائع کرو، ورنہ رہنے دیا جائے''۔[۴۳]

بلا شک بے نفسی، للّٰہیت اور تقوے کا یہ مقام عارفین کو بھی بہت آخر میں جا کر نصیب ہوتا ہے اور اس کا حصول انسان کو ہر ہر لحہ اپنے احتساب اور محاسبے میں مشغول اور متوجہ رکھتا ہے۔

شیخ الہندؒ: انگریزوں کے متعلق استفتا کا جواب لکھنے سے اعراض: نفرت کلیدی وجہ:

ایسے متقی اور باصفا انسان کا کوئی کام جذبات یا غصے سے مغلوب ہونے کا نتیجہ نہیں ہوتا۔انگریز جس سے شیخ الہند نفرت میں بہت بڑھے ہوئے تھے،تحریک خلافت کے دوران جب ترک موالات کے بارے میں حضرت سے استفتا کیا گیا تو اپنے محبوب ترین شاگردوں [حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ،مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اور مولانا مفتی محمد کفایت اللہ رحمہ اللہ] کو بلا کر فرمایا:

''بھائی! یہ استفتا آیا ہے میں چاہتا ہوں اس کا جواب آپ لکھ دیں کیوں کہ حکمِ خداوندی یہ ہے کہ: **وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى** [اور تمھیں کسی قوم کی عداوت اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل وانصاف کے خلاف کچھ کہو، عدل کرو کہ وہی تقوے کے قریب تر ہے]۔اور مجھے انگریزوں سے جس درجے عداوت وبغض ہے اس کے ہوتے ہوئے مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے،کہیں میں ان کے بارے میں خلاف انصاف کوئی بات نہ لکھ جاؤں''۔[۴۴]

شیخ الہندؒ: تکفیر مسلم سے احتراز کا نمونہ:

جو انسان اپنے بدترین دشمن کے متعلق حکم لگانے میں اس درجے محتاط ہو وہ حلقہ یاراں کے لیے

کیوں ریشم کی طرح نرم نہ ہوگا۔اسی احتیاط کی ایک مثال دیکھیے ــــــــ مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں کہ شیخ الہندؒ کے متعلقین میں کسی صاحب نے اہل بدعت کی تردید میں ایک رسالہ لکھا، اہل بدعت نے اس کا جور دلکھا۔ اس میں انھیں کافر قرار دیا۔اس عمل کے جواب میں ان صاحب نے دوشعر کہے:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
دروغے را جزا باشد دروغے

[تم نے مجھے کافر کہا مجھے اس کا غم نہیں، کیوں کہ جھوٹ کا چراغ جلا نہیں کرتا، میں اس کے جواب میں تمھیں مسلمان کہوں گا، کیوں کہ جھوٹ کی سزا جھوٹ ہی ہوسکتی ہے]

انھوں نے شیخ الہندؒ کو یہ شعر سنائے تو آپ نے شعر کی لطافت کی تعریف فرمائی لیکن ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ تم نے لطافت کے ساتھ ہی سہی کافر تو کہہ دیا، حالاں کہ فتوے کی رو سے وہ کافر نہیں ہیں۔اس لیے ان اشعار میں اس طرح ترمیم کرلو:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
دہم شکر بجائے تلخ دروغے
اگر تو مومنی فبھا، والا
دروغے را جزا باشد دروغے [45]

[تم نے مجھے کافر کہا مجھے اس کا غم نہیں، کیوں کہ جھوٹ کا چراغ جلا نہیں کرتا، میں اس کے جواب میں تمھیں مسلمان کہوں گا، اور تلخی کا جواب شیرینی سے دوں گا، اگر تم واقعی مومن ہو تو خیر، ورنہ جھوٹ کی سزا جھوٹ ہی ہوسکتی ہے]

شیخ الہندؒ: فیضان کرم سے کفار تک بہرہ ور تھے:

مخلوق کی بلا تفریق مذہب وملت اور بلا تخصیص نسل ونسب محبت اخلاق صوفیہ میں داخل ہے۔ اخلاق صوفیہ فی الاصل مشکوٰۃ نبوت ہی سے ماخوذ ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر باش رہنے والوں میں تربیت کے متعلق فرمایا گیا:

أفضلهم عنده أعمهم نصيحة، وأعظمهم عنده منزلة أحسنهم مواساة ومؤازرة. [۴۶]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں افضل وہ مانا جاتا تھا، جس کی خیر خواہی عام ہوا کرتی تھی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مرتبے کے لحاظ سے سب سے عظیم اور بڑھا ہوا وہ ہوتا تھا جو ہم دردیٔ خلق اور لوگوں کی ذمے داریوں کا بار برداشت کرنے میں سب سے بہتر ہوتا تھا''۔

شیخ الہندؒ ان ہی اوصاف سے موصوف تھے۔ان کی آغوشِ شفقت مسلمان تو مسلمان کفار تک کے لیے کھلی ہوئی تھی۔مولانا محمود رام پوریؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اور میرے ساتھ ایک ہندو ایک مقدمے کے سلسلے میں دیوبند آئے۔دیوبند پہنچ کر اس ہندو نے مجھ سے پوچھا تم کہاں ٹھہرو گے؟ میں نے کہا میں مولانا [محمود حسنؒ] کے یہاں قیام کروں گا۔وہ ہندو بولا کہ جی میں روٹی تو اپنے اقارب میں کھا لوں گا، باقی سونے کے واسطے اگر کوئی چھوٹی سی چارپائی مجھ کو مل جائے تو وہاں ہی ٹھہر جاؤں گا۔میں نے کہا مل جائے گی تو روٹی کھا کر آجانا، ایسا ہی ہوا، میں نے حضرت مولانا [محمود حسنؒ] کی بیٹھک میں ایک چارپائی اس کے لیے الگ بچھا دی۔ایک چارپائی پر [میں] لیٹ گیا۔وہ ہندو تو پڑتے ہی سو گیا اور میں جاگ رہا تھا کہ حضرت مولانا دبے پیروں زنانہ مکان سے تشریف لائے اور اس ہندو کی چارپائی کی پٹی پر بیٹھ کر اس کے پیر دبانے لگے۔میں ایک دم چارپائی سے کھڑا ہو گیا اور جا کر عرض حضرت چھوڑ دیں میں دبا دوں گا۔فرمایا کہ یہ تمھارا حق نہیں۔میرا مہمان ہے، یہ خدمت میرے ذمے ہے۔میں نے اصرار کیا، اس پر فرمایا کہ جاؤ تم کون ہوتے ہو؟ گڑبڑ مت کرو، بے چارے کی آنکھ کھل جائے گی۔بس وہ ہندو تو پڑا ہوا خرخر کر رہا تھا اور مزاحاً فرمایا کہ ''انا'' مقدر تھا، اور مولانا پاؤں دبا رہے تھے۔[۴۷]

شیخ الہندؒ کے ان واقعات کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ حقوق جو انسان پر قانوناً فرض نہیں ہیں، شیخ الہندؒ نے انھیں باطن کے تصفیے اور روحِ تصوف کی تکمیل کے لیے خود پر اخلاقاً فرض کر لیا تھا۔یہی عارفین سلف اور صوفیائے کاملین کا مابہ الامتیاز ہے جس کی عملی صورت سنت کی اصطلاح میں ''خلق'' ہے۔

اشد ضرورت پر باطنی کمالات وتصرفات کا اظہار: شیخ الہندؒ:

ایسے عرفانی اوصاف اور احسانی کمالات کے حامل انسانوں کے قلب ولسان کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمہ وقت قبولیت ومقبولیت کا درجہ ومرتبہ حاصل ہوتا ہے، یہی وہ حضرات ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی بات کو خالی نہیں لوٹاتے، وہ خود کو خواہ کتنے ہی پردوں میں چھپائیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کے حسنات اور کمالات کو عالم پر آشکارا کر کے ہی رہتا ہے، شیخ الہند کی زندگی کے واقعات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی قبولیت ومقبولیت کے اسی مقام پر فائز تھے:

''مولوی کفایت اللہ صاحب سابق مدرس مدرسہ اسلامیہ میرٹھ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی سے بیعت تھے اور گنگوہ میں پرورش پائی تھی۔ مولانا جس زمانے میں مالٹا میں تھے، ان پر اثنائے ذکر و شغل میں ایک کیفیت پیدا ہوئی کہ خودکشی کی رغبت ہوئی تھی مگر نہ کر سکے اور اس وجہ سے ایسے ضیق میں مبتلا تھے کہ مرجانا بہتر سمجھتے تھے۔ انھوں نے حضرت کی خدمت میں خط لکھا اور مدد چاہی، حضرت نے حسب عادت انکسار کا جواب لکھا جس میں یہ فقرے بھی تھے کہ ''حیرانم کہ بچہ دہقان را بچہ کار سپر انند'' ـــــ مجھے ایسے کام کے لیے اہل کیوں سمجھ لیا وغیرہ وغیرہ...... [آخر وہ حضرت سے ملنے کے لیے حاضر ہوئے] حضرت نے محبت سے پاس بٹھایا اور جب حاضرین چلے گئے تو ان کی طرف خطاب فرمایا کہ تم نے کیا لکھا تھا؟ مجھے تعجب ہوا کہ جانتے بوجھتے تم ایسی بات لکھتے ہو، بھلا میں اس کا اہل کہاں؟ مولوی کفایت اللہ صاحب نے جرأت سے کام لیا اور کہا کہ حضرت اگر کوئی کہے کہ آپ اہل نہیں تو یہ آپ پر نہیں بلکہ حضرت گنگوہیؒ پر اعتراض ہے کہ انھوں نے آپ کو خلیفہ کیوں بنایا، آپ یقیناً اہل ہیں اور حضرت گنگوہیؒ کے خلیفہ ہیں، چوں کہ میں نے اسی دروازے پر تربیت پائی ہے جہاں سے آپ کو سب کچھ ملا ہے اس لیے میرا فرض تھا کہ اپنا دکھ درد عرض کردوں، اس پر حضرت نے سکوت فرمایا اور پھر پوچھا کہ اب کیا حالت ہے؟ عرض کیا کہ کچھ نہیں۔ بعد عشا بہ کمال شفقت حال سنا اور ذکر دوازدہ تسبیح میں کچھ ترمیم فرما کر ارشاد فرمایا کہ حضرت گنگوہیؒ کے یہاں ایک شخص کو یہی حالت پیش آئی تھی تو حضرت نے بھی یہی بتایا تھا جو میں نے بتایا ہے، یہ کہیں کہ کسی طرح اس مصیبت سے نجات مل جائے کہ درس تدریس میں لگیں چھوڑا اس ذکر و شغل کو جس میں جان سے عاجز ہو گیا اور حضرت اصرار فرماویں ـــــ کہ گھبراؤ مت، ذکر و شغل جاری رکھو ورد کرتے رہو جو کر رہے ہو، یہاں تک کہ جب مکان تشریف لے جانے لگے تو فرمایا کہ کتب خانے کے سامنے والے کمرے میں پچھلی رات کو بیٹھ کر اتنے زور سے بارہ تسبیح کرنا کہ میرے گھر تک آواز جائے اور پھر صبح کو نماز فجر کے بعد ارشاد ہوا کہ یہاں حجرے سے باہر مراقب ہو کر بیٹھ جاؤ۔ مولانا لکھتے ہیں کہ اس وقت کی کیفیت ذکر میں نہیں آسکتی کہ اندر بیٹھے کیا کر رہے تھے پھر مجھے اپنا قلب زخمی نظر آتا تھا جیسے اس میں پیپ پڑ گئی ہے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ حضرت اس کو اپنے دست مبارک سے صاف فرما رہے ہیں۔ بعض دفعہ میں چونک پڑتا اور پھر مراقب ہو کر بیٹھ جاتا تھا۔ بعد اشراق حضرت حجرے سے باہر تشریف لائے اور درس کے لیے تشریف لے چلے تو مجھے ساتھ لیا اور بخاری شریف کا سبق ہونے لگا، سبق میں مجھے وہ کیفیت نظر آئی کہ پھر نصیب ہونا مشکل ہے، میرا دل چاہتا تھا کہ حضرت تقریر کو طول دیں اور اس کے لیے حضرت کو چھیڑنے کی ضرورت تھی لہٰذا میں نے الٹے سیدھے سوالات شروع کر دیئے پھر کیا تھا گویا سمندر میں تلاطم آ گیا۔ حضرت نے ایک ایک سوال کے کئی کئی جوابات دینا شروع کیے اور بعض دفعہ یہ بھی فرمایا کہ اس جواب کو کتابوں میں تلاش مت کرنا یہ جواب کتابی نہیں۔ بعض دفعہ میں اشکال پیش کرتا تو اس کا جواب دے کر فرماتے کہ یہاں ایک دوسرا اشکال اور

ہے جس سے شراح نے تعرض نہیں کیا اور اس کے بعد وہ اشکال مع جواب خود ارشاد فرماتے۔ غرض وہ حال جاتا رہا اور طبیعت میں سکون پیدا ہوگیا، تو میں نے عرض کیا کہ میں نے ٹکٹ تھانہ بھون کا لیا تھا فرمایا کہ اچھا جاؤ مگر واپسی میں کم از کم ایک دن یہاں کے واسطے رکھنا کہ ابھی خامی باقی ہے، چناں چہ واپسی پر بجائے ایک دن کے دو دن حضرت کے پاس قیام کیا اور جو خامی مجھے محسوس نہ ہوتی تھی وہ محسوس ہونے لگی کہ جب نماز فجر کے بعد حضرت کے حجرے کے باہر مراقب ہو کر بیٹھتا تو معلوم ہوتا کہ قلب میں کوئی چیز بھری جارہی ہے جس سے دل میں سکون وقوت اور راحت معلوم ہوتی۔ غرض اول حاضری میں زخم قلب کو آلائش سے پاک صاف فرمایا، اور دوسری میں زخموں کو مندمل کیا اور آئندہ مرہم پٹی سے مستغنی اور بے نیاز بنا دیا، اللہ جزائے خیر دے حضرت کو، میری ایسی دست گیری فرمائی کہ جس کا شکر یہ تمام عمر ادا نہیں ہوسکتا''۔ [۴۸]

مولانا گیلانیؒ: باب ایمان میں شکوک کا یقین واطمینان میں تبدل: شیخ الہندؒ کی کرامت:

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنے دیوبند کے زمانہ طالب علمی میں خود اپنی آپ بیتی کے تحت ایک لرزا دینے والا عبرت آموز واقعہ بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دورۂ حدیث کے سال میں نہ جانے کیوں مولانا گیلانیؒ ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق نعوذ باللہ، بہت سے شبہات اور بدگمانیوں میں مبتلا ہوگئے تھے۔ یہ شبہات اور بدگمانیاں مولانا گیلانیؒ کی تصریح کے مطابق دن بہ دن بڑھ رہی تھیں: ''گویا بدگمانیوں کی ایک آگ تھی جو معلوم ہوتا تھا کہ میرے باطن میں بھڑک اٹھی ہے، دو گھنٹے عموماً ترمذی شریف کا درس مسلسل جاری رہتا اور ایک سیاہ کار، سیاہ سینہ ان دو گھنٹوں کے اندر ان ہی شکوک وشبہات کی آتشیں لہروں میں جلتا بھنتا رہتا، ہر حدیث میرے لیے بدگمانی اور سوئے ظن کا چقماق گویا بنتی چلی گئی۔ دماغ صرف ہرزہ اندیشوں اور یاوہ بافیوں کا کارخانہ بنا ہوا تھا''۔ الغرض مولانا گیلانیؒ کی ایمانی کیفیت دن بہ دن ایسے روبہ زوال تھی کہ ''محسوس ہورہا تھا کہ دین کی مرکزی چٹان ہی سے پاؤں، العیاذ باللہ، پھسل رہا ہے'' کہ اچانک قدرت نے دست گیری فرمائی، مولانا گیلانی، دیوبند کے امی رکن حضرت امیر شاہ صاحب مینڈھوؒ کی معرفت اپنے درد کے مداوا اور ایمان کی سلامتی کی غرض سے شیخ الہندؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، حضرت امیر شاہؒ نے تعارف کراتے ہوئے کہا آپ کے شاگرد ہیں کچھ عرض کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ مولانا گیلانیؒ نے خلوت میں اپنے دل کا دکھڑا نہایت ہی رقت آمیز اور دردانگیز کیفیت سے بیان کیا ـــــ یہ سن کر شیخ الہندؒ نے فرمایا:

''مولوی صاحب! آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ اپنا یہ حال جب آپ کے لیے اتنا ناگوار ہے۔ تو یہ بے ایمانی کی نہیں ایمان کی دلیل ہے، ایمان نہ ہوتا تو ان حالات میں اتنا پریشان ہی کیوں ہوتے؟''

مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں:

''بعد کو یہ مضمون خود نبوت کے ارشادات میں بھی ملا، لیکن پہلی دفعہ حضرت شیخ الہند کی زبان مبارک سے یہ الفاظ اس طرح نکلے کہ دل میں معلوم ہوتا تھا کہ کچھ تھا ہی نہیں۔ طمانیت اور بشاشت کی لہریں میرے چہرے پر کھلنے لگیں۔ یہ دیکھ کر تب ارشاد ہوا'' آپ نے کہاں کہاں اور کیا کیا پڑھا ہے؟'' اپنی تعلیمی روداد سنائی گئی، زیادہ وقت قدیم فلسفہ اور منطق کے پڑھنے میں صرف ہوا ہے۔ یہ معلوم کر کے فرمانے لگے،'' جو کچھ آپ کچا پکا نگلتے چلے گئے ہیں، اب وہ سب کچھ باہر نکل رہا ہے، پریشان ہونے کی بات نہیں ہے''۔ شاید بے اختیار گریے کے ساتھ عرض رسا ہوا کہ حضرت! میرے لیے خواہ کچھ بھی ہو، اب یہ حالت نا قابل برداشت ہے۔ میرے لیے اس قسم کے وساوس واوہام کسی حیثیت سے بھی ہوں نا قابل تحمل ہیں۔ میری زندگی خطرے میں ہے۔ اب خواہ دنیا مانے یا نہ مانے، لیکن اپنے ذاتی تجربے کا میں کیا کروں؟ جواب میں فرمایا گیا:'' مولوی صاحب! جاؤ اب کوئی شبہہ اور کسی قسم کا شک تم کو نہ ہوگا''۔ یہ یا اسی کے ہم معنی الفاظ تھے۔ آج سے تقریباً ۴۰ رسال پہلے اللہ کے ایک برگزیدہ دوست کی مبارک زبان سے یہ بات نکلی۔ خاکسار، اس کا دماغ، اس کا دل، اس کی زندہ شہادت ہے کہ اس طویل عرصے میں، بحمد اللہ، پھر کسی قرآنی آیت، یا کسی نص نبوی میں کسی قسم کا شبہہ اب تک تو پیدا نہیں ہوا...... گویا کوئی کیل ٹھونک دی گئی ہے''۔[۴۹]

مولانا انور شاہؒ: اخلاف کے لیے ایقان کا مینارۂ نور: شیخ الہندؒ کی پشتی بانی:

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا بے نظیر حافظہ واستحضار، بے مثل علمی تبحر، رسوخ کامل اور وسعت نظر اپنوں ہی نہیں پرایوں میں بھی مسلم ہے۔ شاہ صاحب تو خیر آفتاب علم تھے، ان کے درس وتقریر سے ایسے باکمال افراد ہندوستان کے مطلع پر ضیاء بار ہوئے جن کی نظیر ممکن نہیں۔ غور فرمایا جائے کہ کیا حضرت شاہ صاحب کا یہ علم ومرتبہ اور طلبا کے لیے درسی ایقان کا منبع ہونا صرف حضرت شاہ صاحب کی اکتسابی اور ذاتی باطنی کیفیت کا مظہر تھا یا اس کے پیچھے کسی ولی کامل کی پشتی بانی بھی کارفرما تھی؟ جس وقت شیخ الہندؒ سفر پر روانہ ہونے لگے جس میں اسیر مالٹا ہو کر جانے کی نوبت آئی، اس وقت:

''علامہ انور شاہ صاحبؒ باوجود یہ کہ ترمذی کا سبق پڑھانے کے لیے آکر بیٹھ گئے تھے، عبارت بھی پڑھ دی گئی تھی۔ [مولانا انور شاہ نے] مفارقت حضرت [شیخ الہندؒ] کے غم میں کچھ نہ فرمایا، بلکہ ذرا دیر توقف فرما کر کتاب بند کر دی اور حضرت [شیخ الہندؒ] کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت اس وقت چارپائی پر پیر لٹکائے بیٹھے تھے۔ شاہ صاحبؒ نہایت خاموشی سے جا کر بیٹھ گئے اور حضرت [شیخ الہندؒ] کی دونوں پنڈلیوں کو پکڑ کر سینے سے چمٹا لیا۔ شیخ الہندؒ نے بھی تکلف سے کام نہ لیا، یوں ہی رہنے دیا فرمایا!'' شاہ صاحب! آپ کو میری موجودگی میں شبہات پیش آتے تھے۔ میں نہ رہوں گا تو شبہات پیش نہ آئیں گے، اور اگر

آئیں بھی تو قدرت رہنمائی کرے گی۔ جاؤ! خدا کے سپرد سبق پڑھاؤ''۔ [۵۰]

شیخ الہندؒ کے اس روحانی تصرف اور پشتی بانی سے مولانا انور شاہؒ کو خود تو کیا شبہات پیدا ہوتے، وہ دوسروں کے لیے شبہات کے ازالے اور تصفیے کا تریاق بن گئے۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے شاہ صاحب کی درسی تقریر کے کمالات اور اثرات کے ذیل میں اپنے پہلے ہی دن کے تاثرات کو ایک جملے میں یوں سمو دیا ہے:

''[شاہ صاحب کی تقریر کا] پہلا دن تھا، جس میں قرآن کے بعد دین کا سارا بنیادی نظام میرے لیے قطعی و یقینی ہوگیا''۔ [۵۱]

اس اطمینان و ایقان کی گواہی شاہ صاحب کے متعلقین، تلامذہ اور احباب سب ہی نے دی ہے۔

متذکرہ واقعات تو لوگوں کو گمراہی سے ہدایت کی طرف واپس لانے سے متعلق تھے۔ ایک واقعہ ایسا بھی ملاحظہ کیجیے جس میں ایک گستاخ کو اس کے انجام بد سے ڈراتے ہوئے توبہ کی تلقین کی گئی تھی، لیکن اس نے اپنی گستاخی سے خود پر ہدایت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کرلیا۔ اور ایمان سے محروم ہوگیا۔

شیخ الہندؒ کی تنبیہ: احمد احسن امروہوی کا انجام بد:

مرحوم مولانا محمد حسین بٹالوی اپنے عہد میں ردّ تقلید اور حمایت اہل حدیث کی ایک ''پُر شور'' آواز تھے ـــــ انھوں نے برعظیم کے تمام اہل السنّت والجماعت احناف کو ایسے دس مسائل کا انتخاب کر کے چیلنج دیا کہ اگر احناف، ان مسائل کے اثبات میں کوئی آیت، یا کوئی حدیث صحیح، صریح، قطعی الدلالۃ پیش کر دیں تو مولانا بٹالوی فی آیت اور فی حدیث ۱۰/ روپے انعام دیں گے۔ گویا مولانا بٹالوی کے زعم میں ان دس مسائل میں اہل سنت کے پاس کتاب وسنّت سے کوئی دلیل موجود نہیں تھی۔ اس چیلنج کے باعث ایک طرف جہاں علمائے احناف کی تحقیر و تذلیل ہوئی وہیں دوسری جانب امام اعظم ابوحنیفہؒ کی تجہیل بھی لازم آئی ـــــ ظاہر ہے یہ تعلّی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا محمود حسنؒ کو سخت ناگوار ہوئی ـــــ شیخ الہندؒ نے مولانا نانوتوی کی اجازت واشارے سے اس اشتہار کا جواب ''ادلہ کاملہ'' کے نام سے دیا۔ شیخ الہندؒ منتظر رہے کہ مولانا بٹالویؒ اس کے جواب میں قلم اٹھائیں۔ مولانا بٹالویؒ نے تو اس کا جواب نہیں دیا بالآخر جواب دہی کے لیے ایک ایسے صاحب کا انتخاب ہوا جو اپنی زبان کی تیزی اور قلم کی کاٹ میں طاق ہونے کے باعث حلقہ اہل حدیث میں ''احسن المناظرین و المتکلمین'' کے لقب سے جانے جاتے تھے۔ ان کا نام محمد احسن امروہوی تھا۔ امروہوی موصوف نے ''ادلہ کاملہ'' کا جواب ''مصباح الادلہ لدفع الادلۃ الذلہ'' کے نام سے لکھا۔ مولانا بٹالوی نے خود جواب لکھنے سے پہلو تہی فرماتے ہوئے امروہوی صاحب کی کتاب کو ''لاجواب اور جواب باصواب'' قرار دیا۔ شیخ الہند نے اس اعلان کے بعد ''مصباح الادلۃ'' کا جواب ''ایضاح الادلہ'' کے

نام سے تحریر فرمایا جس میں جابجا محمد احسن امرہوی کی لسانی گستاخیوں اور قلمی بے احتیاطیوں پر تنبیہ فرمائی۔ شیخ الہندؒ لکھتے ہیں:

''[مصنف مصباح الادلہ] بعض مواقع میں اپنے جوش میں بے باکانہ کلمات تکفیر بول اُٹھے ہیں''۔[۵۲]

ایک مقام پر امروہوی صاحب کی گستاخیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجتہد صاحب ماشاء اللہ مسلم ہیں، گو بدفہم اور متعصب و کج طبع اور ہر چند عباد صالحین وعلمائے دین کی شان میں گستاخ اور مقلد طریقہ رفاض ہیں اور اگرچہ تکفیر مومنین میں معتزلہ وخوارج کے شاگرد ہیں اور یہ امور گو یقیناً سخت خوف ناک ہیں اور سبب خذلان وہلاکت''۔[۵۳]

شیخ الہندؒ نے جب یہ الفاظ تحریر فرمائے ہوں گے، اس وقت ان کے حاشیہ گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ وہ کوئی پیشین گوئی فرمارہے ہیں۔ آپ کا مقصد امروہوی صاحب کو اکابر کی شان میں گستاخیوں پر تنبیہ اور اس کے خوف ناک انجام سے ڈرانا تھا ـــــ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ امروہوی صاحب کے متعلق شیخ الہندؒ کے اشارہ کردہ جملے ''باعث خذلان وہلاکت'' پورے ہوئے۔ امروہوی صاحب غیر مقلدیت سے ترقی کر کے مرزا قادیانی کے حلقہ ارتداد میں داخل ہوگئے۔ اندازہ کیجیے وہ شخص جس کے نزدیک امام اعظم ابوحنیفہؒ کی ذات گرامی لائق تقلید نہیں تھی وہ مرزا غلام احمد قادیانی جیسے کاذب پر ایمان لاکر اس کی اقتدا کرنے لگا۔ مرتد ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی بھی نمونہ عبرت بن گئی، امروہوی صاحب مرزائیوں کی بھیک اور خیرات کے دست نگر ہوگئے۔ مرزا قادیانی کے مجموعہ اشتہارات نمبر ۸۷/ پر درج ہے:

اس وقت ضروری طور پر اپنے دوستوں کی خدمت میں التماس کرتا ہوں کہ اخویم مکرم حضرت مولوی سید محمد احسن صاحب جو اس وقت مقام بھوپال محلّہ چوبدار پورہ میں نوکری سے علیحدہ ہوکر خانہ نشین ہوگئے ہیں، بوجہ تکالیف عسر ہمدردی کے لائق ہیں...... لہٰذا ہر ایک بھائی کی اپنے اپنے مقدرت کے موافق توجہ درکار ہے۔[۵۴]

اس کے بعد مرزا قادیانی نے ان بائیس افراد کی فہرست دی ہے جنھوں نے مرتد احمد احسن امروہوی کو دو آنے سے پانچ روپے ماہوار خیرات دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ان میں سے ایک نے دو آنے کا، دس آنے کا، چار آنے کا، دو نے آٹھ آنے کا، پانچ نے ایک روپے کا، تین نے دو روپے کا اور ایک نے پانچ روپے کا وعدہ کیا۔ یہ کل ۲۹/روپے دو آنے کی رقم ہوئی جس کا ۲۲/افراد نے وعدہ کیا۔ اور مرزا غلام قادیانی نے **''هل من مزيد''** کی غرض سے اشتہار جاری کیا۔ مرزا جو ''رئیس قادیان'' کہلاتا تھا، خود اپنے پلّے سے سو پچاس روپے بہ آسانی بھجوا سکتا تھا۔ ورنہ اپنے دو تین مال دار مریدوں کو کہہ کر احمد احسن امروہوی کی کفالت کا ذمے دار ٹھہرا سکتا تھا۔ لیکن اتنی ارزاں اور حقیر سی بات کے لیے باقاعدہ اشتہار کے اجرا سے فی الاصل قدرت کو مرزا کی خست

اور احمد احسن کی ذلت کا اشتہار دلوانا مقصود تھا ـــــ یہ تھا وہ انجام بد جس کی طرف شیخ الہندؒ نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا: ''باعث خذلان وہلاکت''۔ بالفاظ دیگر ائمہ ہدیٰ کی شان میں گستاخیوں کا یہی وہ انجام تھا، جس کی طرف شیخ الہندؒ نے ''سبب خذلان وہلاکت'' کہہ کر تنبیہ فرمائی تھی۔

واقعات ونقول کی فہرست بہت طویل ہے بہ طور خلاصہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ شیخ الہندؒ کو اللہ تعالیٰ نے ہر اعتبار سے بڑا بنایا تھا۔ اگر ایک طرف شیخ الہندؒ اپنے علم وفضل کے اعتبار سے محدث جلیل، تالیف و تصنیف کے پہلو سے ادیب اریب، سیاست وجہاد کے لحاظ سے مجاہد عظیم، اذکار وعبادات کے رخ سے صوفی باصفا نظر آتے تھے تو دوسری طرف بندگان خدا پر شفقت، بے نفسی وفنائیت، فروتنی وعاجزی، دنیا سے نہایت استغنا کے ساتھ ایک گونا تعلق، اکرام ضیف، اساتذہ وشیوخ ہی نہیں، ان کی اولاد، بلکہ اولاد کی اولاد کے ساتھ بھی اساتذہ کی نسبت سے احترام وتعلق کے معاملے، اور طالبان علوم پر شفقت ورافت ایسے عصر حاضر میں عنقا اوصاف وکمالات ہیں جس نے شیخ الہندؒ کو اپنے عہد میں، ''عباد الرحمٰن'' کا مظہر کامل بنا دیا تھا۔ شیخ الہندؒ کی اس جامعیت وکاملیت کو آپ کے مقتدا مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے آپ کے متعلق ایک ہی جملے میں سمو کر بیان کر دیا ہے:

''طریق سلوک میں اصل مقصود احسان ہے سو بفضلہ تعالیٰ حاصل ہے''۔ [۵۵]

احسان وعرفان کی یہی وہ کیفیت تھی کہ شیخ الہند نے علم وعمل کا جامع بن کر تا زندگی انسانی حیات کے مختلف گوشوں کو معمور ومنور کیا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ دو بحور علم واحسان نے مل کر شیخ الہند کو تیار کیا تھا۔ اور پھر شیخ الہند نے ''کارخانۂ علوم'' بن کر ہندوستان کو علم وفضل، وعظ وارشاد، افتا وتصنیف، دعوت وجہاد اور مناظرے ومکالمے کے لیے بے مثل اور لافانی رجال کار عطا کیے۔ آپ کی تربیت وتاثیر سے ہر فرد، فرق مراتب کے باوصف، اپنے وقت کا ''شیخ الہند'' بنا۔ بالفاظ دیگر شیخ الہندؒ کے تلامذہ اور مسترشدین میں جس کو جس فن سے مناسبت اور اہلیت تھی ''نسبت محمودی'' اس کے ظرف کے مطابق اس میں ضرور منتقل ہوئی۔ یہ نسبت وتعلق ایسا ہی ہے جیسا سورج کا اس کی کرنوں سے ہوتا ہے۔ سورج کی ہر ہر کرن اپنی تابانی میں آفتاب ہی کا فیض ہوتی ہے۔ آفتاب ان تمام شعاعوں سے ماورا ہونے کے باوجود اپنی کرنوں سے مربوط اور متعلق بھی رہتا ہے۔ شیخ الہندؒ کے چیدہ چیدہ اوصاف وکمالات کا فیض ان کے اخلاف وتلامذہ میں ان کے اپنے اپنے پیمانے اور ظرف کے مطابق منتقل ہوا لیکن ان مختلف النوع اور متنوع بلکہ متضاد ومتبائن اوصاف کی جامع شخصیت ایک ہی رہی: شیخ الہند محمود حسنؒ ؎

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند

آنچہ استادِ ازل گفت، ہماں می گویم

[کارکنان قضا وقدر نے مجھے طوطی کی طرح آئینے کے پیچھے بٹھا رکھا ہے۔ جو کچھ بھی معلم ازل کہتا ہے، میں وہی بولتا ہوں]

حواشی

۱- مولانا ادریس کاندھلویؒ، سیرۃ المصطفیٰ، کراچی: مکتبہ عمر فاروق، ۲۰۱۰ء، جلد ۱، صفحہ ۲۶۳۔

۲- مسلم بن الحجاج القشیریؒ، **الصحیح المسلم، کتاب البر والصلۃ**، رقم ۱۲۸۱۔

۳- عبدالرشید ارشد، بیس بڑے مسلمان، لاہور: مکتبہ رشیدیہ، ۲۰۰۱ء، صفحہ ۲۳۶۔

4- Barbara Metcalf, "The Madrasa at Deoband: A Model for Religious Education in Modern India", *Modern Asian Studies,* 12, I, [1978], p. 122.

۵- مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہہ الامت، لاہور: مکتبہ مدنیہ، ۱۹۹۲ء، جلد ۲، قسط ۷، صفحہ ۹۳۔

۶- مولانا عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ [مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری]، کراچی: مجلس یادگار شیخ الاسلام، ۲۰۰۷ء، صفحہ ۱۴۳۔

۷- شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارن پوریؒ، آپ بیتی، لاہور: مکتبہ الحرمین، [س-ن]، جلد ۲، صفحہ ۶۰۷۔

۸- حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، ''ذکر محمودؒ''، مشمولہ تذکرہ شیخ الہندؒ صفحات ۵۳۰-۵۳۱۔

۹- شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مکتوبات شیخ الاسلام، کراچی: مجلس یادگار شیخ الاسلام، ۱۹۹۴ء، جلد ۲، صفحات ۲۰۰-۲۰۱، مکتوب ۶۲۔

۱۰- مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، ''سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی''، مشمولہ نادر مجموعہ رسائل جناب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، کراچی: میر محمد کتب خانہ، [س-ن]، صفحہ ۸۔

۱۱- مولانا میاں اصغر حسینؒ، حیات شیخ الہندؒ، لاہور: ادارۂ اسلامیات، ۱۹۷۷ء، صفحہ ۱۶۷۔

۱۲- مولانا عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحہ ۱۵۰۔

۱۳- مولانا میاں اصغر حسینؒ، حیات شیخ الہندؒ۔

۱۴- مولانا عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحہ ۱۵۰۔

۱۵- ایضاً، صفحہ ۱۵۱۔

۱۶- مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہہ الامت، لاہور: مکتبہ مدنیہ، ۱۹۸۶ء، جلد ۱، صفحہ ۱۰۶۔

۱۷- ایضاً۔

۱۸- امام محمد بن عبداللہ الحاکم النیسابوریؒ، **المستدرک علی الصحیحین**، بیروت: دارالکتب العلمیۃ، ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۲م، **کتاب الجهاد**، جلد۲، صفحہ۸۶، رقم ۲۴۰۸۔

۱۹- مولانا عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحات ۱۵۱-۱۵۳۔

۲۰- حکیم الامت حضرت تھانویؒ، ملفوظات حکیم الامتؒ، ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۳۰ھ، جلد۳، صفحہ۱۲۷، ملفوظ۱۹۳۔

۲۱- سلیمان بن احمد الطبرانیؒ، **المعجم الأوسط**، قاہرہ: دارالحرمین، ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۵م، **باب المیم، من اسمه محمد، محمد بن عثمان بن أبي شيبة**، جلد۵، صفحہ۳۵۶، رقم ۵۵۴۱۔

۲۲- مولانا عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحہ۱۵۰۔

۲۳- شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، سفرنامہ شیخ الہندؒ، لاہور: مکتبہ محمودیہ، ۱۹۷۷ء، صفحہ۱۵۹۔

۲۴- مولانا عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحہ۱۶۸۔

۲۵- حضرت مدنیؒ، سفرنامہ شیخ الہندؒ، صفحہ۱۵۹۔

۲۶- حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ، ''پچاس مثالی شخصیات''، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام [مرتب: محمد عمران قاسمی بگیانوی]، مردان: مکتبۃ الاحرار، ۲۰۱۱ء، جلد۷، صفحہ۴۲۲۔

۲۷- ایضاً، صفحات ۴۲۲-۴۲۳۔

۲۸- ایضاً، صفحہ۴۲۳۔

۲۹- ایضاً، صفحہ۴۲۴-۴۲۵۔

۳۰- مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہ الامت، جلد۱، صفحات ۱۰۶-۱۰۷، قسط اوّل۔

۳۱- مولانا عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرہ مشائخ دیوبند، بجنور: زرین کتب خانہ، ۱۹۵۸ء، صفحہ۲۰۲۔

۳۲- مولانا قاری محمد طیبؒ، ''پچاس مثالی شخصیات''، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام، جلد۷، صفحات ۴۲۶-۴۲۷۔

۳۳- ایضاً، صفحہ۴۳۹۔

۳۴- ایضاً، صفحہ۴۳۹-۴۴۰۔

۳۵- ایضاً، صفحہ۴۲۱-۴۲۲۔

۳۶- ایضاً، صفحہ۴۲۶۔

۳۷- شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارن پوریؒ، آپ بیتی، صفحہ۹۵۴۔

۳۸- مولانا قاری محمد طیبؒ، ''پچاس مثالی شخصیات''، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام، جلد۷، صفحہ۴۴۰۔

۳۹- مولانا عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحات ۱۶۸-۱۶۹۔

۴۰- مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہ الامت، جلد۱، صفحات ۱۰۵-۱۰۶، قسط۴۔

۴۱- مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہ الامت، جلد۱، صفحات ۴۲-۴۳، قسط۵۔

۴۲- حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، ''ذکرِ محمودؒ''، مشمولہ تذکرہ شیخ الہندؒ، صفحہ ۵۳۰۔

۴۳- شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا سہارن پوریؒ، آپ بیتی، جلد ۲، صفحہ ۹۵۰۔

۴۴- مولانا قاری محمد طیبؒ، ''پچاس مثالی شخصیات''، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام، جلد ۷، صفحات ۴۲۷-۴۲۸۔

۴۵- مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، اکابر دیو بند کیا تھے؟، کراچی: ادارۃ المعارف، ۲۰۰۳ء، صفحہ ۲۳۔

۴۶- امام محمد بن عیسیٰ الترمذیؒ، **الشمائل المحمدية**، بیروت: دار الحدیث، ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ م، **باب ما جاء في تواضع رسول الله صلى الله عليه وسلم**، صفحہ ۱۶۲۔

۴۷- حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، ملفوظات حکیم الامتؒ، جلد ۲، صفحات ۲۰۶-۲۰۷، ملفوظ ۲۸۵۔

۴۸- شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارن پوریؒ، آپ بیتی، جلد ۲، صفحات ۱۰۰۶-۱۰۰۸۔

۴۹- مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن، کراچی: مکتبہ عمر فاروق، ۲۰۱۱ء، صفحات ۱۰۸-۱۱۲۔

۵۰- مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہ الامت، جلد ۱، صفحات ۱۰۸-۱۰۹۔

۵۱- مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن، صفحہ ۶۱۔

۵۲- شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ، ایضاح الادلہ، دیو بند: مطبع قاسمی، [س-ن]، صفحہ ۵۔

۵۳- ایضاً، صفحہ ۳۹۳۔

۵۴- مرزا غلام احمد قادیانی، مجموعہ اشتہارات، ربوہ: الشرکۃ الاسلامیہ، [س-ن]، جلد ۱، صفحہ ۳۳۷۔

۵۵- مولانا قاری محمد طیبؒ، ''پچاس مثالی شخصیات''، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام، جلد ۷، صفحات ۴۲۹۔

وفیات

......حضرت مولانا حاجی احمد رحمہ اللہ [گمانی شریف]

......حضرت مولانا مفتی حمید اللہ جان رحمہ اللہ [لکی مروت]

......حضرت مولانا میاں محمد عثمان دین پوری صاحب کی والدہ محترمہ رحمہا اللہ [دین پور، ضلع رحیم یار خان]

......جامعہ قاسمیہ [لاہور] درجہ ثالثہ کے طالب علم ابرار علی کے والد مکرم رحمہ اللہ [کبیر والہ]

......جامعہ قاسمیہ [لاہور] درجہ ثالثہ کے طالب علم محمد عثمان کے والد محترم رحمہ اللہ [شاہدرہ، لاہور]

......مجلّہ ''صفدر'' کے قاری جناب غلام مصطفیٰ صاحب رحمہ اللہ [بھلہ، چکوال]

......مولانا قاری محمد جمیل اجمل رحمہ اللہ [عمر مسجد، محمد پورہ، فیصل آباد]

قارئین سے مرحومین کی مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی درخواست ہے۔ [ادارہ]